ISBN 978-969-9266-04-1

مفکرِ اسلام امام احمد رضا حنفی کے اصلاحی و تحقیقی افکار کا ترجمان

# ماہنامہ معارفِ رضا کراچی

جلد: 31 شمارہ: 03

مارچ ۲۰۱۱ء / ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

## حُسنِ ترتیب





ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا انٹرنیشنل

25- جاپان مینشن، ریگل، صدر، جی پی او صدر، کراچی-74400، اسلامی جمہوریہ پاکستان۔
فون: 92-21-32725150+ فیکس: 92-21-32732369+
ای میل: imamahmadraza@gmail.com
ویب سائٹ: www.imamahmadraza.net

ہدیہ فی شمارہ: 30 روپے
سالانہ: عام ڈاک سے: -/300 روپے
رجسٹرڈ ڈاک سے: -/600 روپے
بیرونِ ممالک: 30 امریکی ڈالر سالانہ



نوٹ: رقم دستی یا منی آرڈر / بینک ڈرافٹ بنام "ادارہ تحقیقاتِ امام احمد رضا" ارسال کریں، چیک قابلِ قبول نہیں۔
ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر: کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 45-5214- حبیب بینک لمیٹڈ پریڈی اسٹریٹ برانچ، کراچی۔

(پبلشر مجید اللہ قادری نے باہتمام حریت پرنٹنگ پریس، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی سے چھپوا کر دفتر ادارہ تحقیقاتِ امام احمد رضا انٹرنیشنل سے شائع کیا۔)

# تعلیماتِ رضا کے فروغ میں علمائے بنگلہ دیش کی خدمات

اپنی بات

پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری

امام احمد رضا خاں قادری برکاتی بریلوی علیہ الرحمۃ کی تصنیفات وتالیفات وحواشی وغیرہ جملہ علوم وفنون میں تمام عالمِ اسلام میں مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ امام احمد رضا محدث بریلوی نے جو کچھ ۱۲۸۶ھ۔۱۳۴۰ھ (1870ء تا 1921ء) 55 سال میں لکھا وہ صرف ان کے زمانے کے لوگوں کے لیے ہی نہیں شاید اب قیامت تک لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی ہوگا۔ امام احمد رضا نہ صرف مجدد دین وملّت تھے بلکہ نہ جانے کتنے علوم وفنون کی تجدیدِ نو کرنے والے تھے اور نہ جانے کتنے علوم میں وہ یکتا روز گار تھے اور نہ جانے کتنے علوم وفنون ان کے چلے جانے سے اب لوگوں کی فہم سے ہی اٹھ گئے۔ ہر صدی میں مجدد دین وملت تشریف لاتے رہے اور وہ دین کی تجدید فرماتے رہے اور سلسلہ مجدد ملّت جاری رہا مگر اب محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ دنیا کسی نئے مجدد سے محروم رہے گی چنانچہ 15ویں صدی ہجری کے 32 سال گذر گئے مگر ابھی تک ملّت اسلامیہ کے سامنے ایسی کوئی علمی شخصیت نہ آئی جس پر اس کی مجددیت کا اجماع ہو جائے۔ اگر شخصیات سامنے آئی بھی ہیں تو کسی ایک مسئلے پر ان کی آرا ملّت نے استفادہ کیا مگر کوئی بھی ایسی شخصیت ۱۳۴۰ھ / 1921ء کے بعد نظر نہیں آئی جو احمد رضا کی طرح فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کا نمونہ اور تفسیر قرار پائے۔

امام احمد رضا کی علمی وسعتوں اور ان کی قلمی کاوشوں کو سامنے رکھتے ہوئے راقم یہ خیال کرتا ہے کہ امام احمد رضا نہ صرف چودھویں صدی ہجری کے مجددِ دین وملّت تھے بلکہ جب تک امام احمد رضا جیسا کوئی دوسرا عالمِ دین جو کل علوم وفنون پر احاطہ رکھتا ہو پیدا نہ ہو جائے اور ملت اس کے تجدیدی کاموں سے مستفیض نہ ہوں اس وقت تک امام احمد رضا کی مجددیت قائم رہے گی اور وہ اس وقت تک Acting mujaddid رہیں گے۔ یہ سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فضل وکرم سے ہے اور شاید امام احمد رضا کے یہ الفاظ مقبولِ بارگاہ ہو چکے کہ:

کام وہ لے لیجیے تم کو جو راضی کرے
ٹھیک ہو نام رضا تم پہ کروڑوں درود

امام احمد رضا نے اللہ رب العزت کی دی ہوئی توفیق سے اور رسول اکرم ﷺ کی عطائے کرم سے دین کی خدمت کر کے اپنے اللہ ورسول کو راضی کر لیا اور ان کا نام رضا اسم با مسمّٰی بن گیا۔

امام احمد رضا خاں قادری محدث بریلوی اپنے زمانۂ حیات ہی میں تمام علماو مشائخ کا مرجع تھے۔ چنانچہ برصغیر پاک وہند کے چپے چپے سے ان کے پاس ایک ایک وقت میں ۴۔۴ سو استفتا یعنی سوالات آتے تھے اور امام احمد رضا فرداً فرداً سب ہی کا جلد از جلد جواب دیتے۔ برصغیر کے علاوہ بھی دیگر ممالک سے ان کے پاس استفتا آتے۔ پہلے اور دوسرے حج کے موقعہ پر عرب کے علما و مشائخ نے بھی موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ سے بڑے اہم سوالات کیے اور آپ کے حافظے نے بغیر کسی کتاب کی مدد کے ان تمام سوالات کے بہت ہی مدلل جواب دیے کہ عرب کے علما ششدر رہ گئے اور آپ کو مجددِ دین وملّت قرار دیا۔ اس موقع پر سوالات کے جواب میں جو رسائل منصۂ شہود پر آئے وہ مندرجہ ذیل کتب ہیں:

۱۔ الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیہ ۱۳۲۳ھ / 1905ء
۲۔ کفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدراہم ۱۳۲۴ھ / 1906ء
۳۔ الفیوض المکیہ لمحب الدولۃ المکیۃ، ۱۳۲۵ھ / 1907ء
۴۔ النیرۃ الوضیہ فی شرح الجوہرۃ المضیۃ، ۱۲۹۵ھ

ان کتب اور امام احمد رضا کے ملفوظات کو سن کر عرب علما نے آپ کی علمی بصیرت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مجدد اور مجتہد قرار دیا اور آپ سے سندِ خلافت کے علاوہ سندِ فقہ وحدیث حاصل کیں جس کی تفصیل پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد نقشبندی مجددی دہلوی علیہ الرحمۃ کی مندرجہ ذیل کتب میں دیکھی جا سکتی ہے:

۱۔ امام احمد رضا اور عالم اسلام، مطبوعہ 1983ء، ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا۔

۲۔ حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مطبوعہ 1981ء اسلامی کتب خانہ، سیالکوٹ۔

راقم الحروف نے امام احمد رضا اور علماے پاکستان کے حوالے سے کئی رسائل تحریر کیے ہیں جس میں مختلف علاقوں سے علما و مشائخ کے استفتا کے جواب میں امام احمد رضا کی تعلیمات کو اجاگر کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ امام احمد رضا اپنے ہم عصر علما و مفتیان میں اس مقام پر تھے کہ علما و مشائخ بھی امام احمد رضا کے فیصلے اور رائے کو مستند حرف آخر سمجھتے تھے جس کے ثبوت کے لیے فتاویٰ کی 12 ضخیم جلدیں آج بھی گواہ ہیں۔

پچھلے دنوں راقم اعلیٰ حضرت فاونڈیشن چٹاگانگ بنگلہ دیش کی دعوت پر 13ویں امام احمد رضا کانفرنس میں شرکت کے لیے بنگلہ دیش گیا تھا۔ راقم 28 جنوری 2011ء سے 3 فروری 2011ء تک مختلف شہروں میں امام احمد رضا کانفرنسوں میں شریک رہا جب کہ مرکزی امام احمد رضا کانفرنس کا انعقاد ۲ فروری 2011ء کو چٹاگانگ کے اسلامی ہال میں تھا جس میں پورے بنگلہ دیش سے اکابر علماے اہلِ سنّت اور چٹاگانگ اور اس کے اطراف کے شہروں کے سینکڑوں علما اور ہزاروں معتقدین شریکِ محفل تھے جس کی صدارت حضرت علامہ مولانا محمد ادریس رضوی مدظلہ العالی فرمارہے تھے جو مولانا سردار احمد لائلپوری علیہ الرحمۃ کے شاگردِ رشید ہیں۔ اس مرکزی کانفرنس میں راقم کا دو گھنٹے کا خطاب تھا۔ راقم نے Presentation کی صورت میں امام احمد رضا کے سائنسی افکار پر اختصار سے گفتگو کی تھی۔ محترم المقام علامہ مولانا بدیع العالم رضوی صاحب نے جو اعلیٰ حضرت فاونڈیشن کے چیئر مین بھی ہیں انھوں نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ اس موقعہ پر فاونڈیشن کی طرف سے المختار نامی سوینئر اردو اور بنگلہ زبان میں نکالا گیا تھا، جس میں احقر کا پیغام، امام احمد رضا اور تحقیق زلزلہ کا مقالہ شائع کیا۔ ساتھ ہی اس رسالے میں راقم کی خدمات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

راقم نے اپنے 8 دن کے قیام میں اہلِ سنّت کے متعدد مدارس، خانقاہوں اور اداروں کا دورہ کیا اور متعدد علما و مشائخ، اسکالرز، اساتذۂ کرام اور عوام الناس سے ملاقات کی۔ کثیر تعداد میں علما و مشائخ احقر سے ملنے بھی تشریف لائے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ کسی الگ مضمون یا سفر نامہ کے طور پر شائع کروں گا۔ یہاں امام احمد رضا کی تعلیمات کے اثرات کے حوالے سے ایک اجمالی تاثر پیش کر رہا ہوں۔

امام احمد رضا کی حیات میں برصغیر میں انڈیا، پاکستان بنگلہ دیش سب ہی شامل تھے۔ پورے برصغیر سے امام احمد رضا کے پاس استفتا آتے تھے۔ احقر نے جب فتاویٰ رضویہ پر نظر ڈالی تو 12 ضخیم جلدوں میں ۲۰ سے زائد استفتا نظر آئے جو موجودہ بنگلہ دیش اور سابق مشرقی پاکستان کے کئی علاقوں سے علما و مشائخ نے استفتا بھیجے تھے۔ جن شہروں سے استفتا بھیجے گئے تھے ان میں ضلع سلہٹ، ضلع چاٹگام اور ضلع میمن سنگھ زیادہ نمایاں ہیں۔ جن علما نے استفتا بھیجے ان کے نام بھی ملاحظہ کریں:

ضلع چاٹگام سے مولوی جمال الدین، مولوی عبد الحمید، مولوی محمد اسمٰعیل، مولوی محمد مہدی جب کہ ضلع سلہٹ سے مولوی انوار الدین، مولوی عبد الحکیم، مولوی عبد الغنی، مولوی عبد الحمید، مولوی عبد الرزاق، مولوی محمد اکرام، مولوی ممتاز الدین وغیرہ، ضلع میمن سنگھ سے بھی چند نام ملاحظہ کریں مولوی سعید الرحمٰن، مولوی عبد الحافظ اور مولوی عبد الحلیم وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

ان علما کے علاوہ امام احمد رضا محدث بریلوی کے دو خلفا حضرت مولانا عبد الحکیم رضوی اور علامہ شمس الدین اخونجی کی خدمات کا بھی ادارئے کے صدر سید وجاہت رسول قادری صاحب نے اپنے پچھلے سال کے دورۂ بنگلہ دیش میں ذکر فرمایا ہے اور وہاں کے علما اور اسکالرز سے ان دو حضرات کی تفصیلی خدمات قلمبند کرنے کے لیے کہا ہے۔ اس کے علاوہ فتاویٰ رضویہ میں ۲۰ سے زیادہ ان طلبہ کا پتہ چلا ہے جو بنگال سے منظر اسلام میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے اور انھوں نے امام احمد رضا سے وقتاً فوقتاً تحریری استفتا کے ذریعے جوابات حاصل کیے۔ ان طلبہ نے یقیناً بنگلہ دیش جاکر تعلیماتِ رضا کو فروغ دیا ہوگا۔ احقر کے نزدیک یہ ایک Ph.D کا عنوان بنایا جاسکتا ہے کہ "امام احمد رضا کے تلامذہ، خلفا اور اہلِ ارادت کا بنگلہ دیش میں تعلیماتِ رضا کے سلسلے میں کردار" اور پروفیسر ڈاکٹر عبد الودود جو جگن ناتھ یونیورسٹی میں شعبہ کے صدر ہیں وہ کسی بھی ریسرچ اسکالر سے یہ کام کرواسکتے ہیں۔

راقم الحروف نے اپنے دورۂ بنگلہ دیش کے دوران چاٹگام اور اس کے اطراف میں موجود کئی اداروں، مدارس، خانقاہوں کا دورہ کیا جس میں سب سے زیادہ نمایاں جامعہ احمدیہ سنیہ عالیہ ہے جس کا سنگِ بنیاد ۱۹۵۴ء میں حضرت علامہ حافظ قاری سید احمد شاہ القادری سریا

کوٹی (المتوفی ۱۳۸۰ھ / 1961ء) نے چٹا گانگ میں رکھی اور ان کلمات کے ساتھ اس مدرسہ کی ابتدا کی گئی "یہاں مسلکِ اعلیٰ حضرت کی بنیاد پر دین کی تعلیم دی جائے گی۔" یہ کلمات راقم نے اپنے دورۂ بنگلہ دیش کے کم و بیش تمام ہی تمام اکابر علما اہلِ سنّت سے سماعت کیے، یہاں تک کہ جب احقر انجمن رحمانیہ احمدیہ سنیہ کے آفس کے معائنے کے لیے گیا جو لگ بھگ 100 کے قریب مدارس کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے تو انجمن کے نائب صدر جناب محسن صاحب اور جنرل سیکریٹری جناب انوار السلام صاحب نے بھی اپنے ادارے کا تعارف کراتے ہوئے کم و بیش یہ ہی الفاظ ادا کیے کہ الحمد للہ اس ادارے کی بنیاد اعلیٰ حضرت کے مسلک کے مطابق ہی رکھی گئی ہے۔ اس کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ادارے یعنی مدرسے کی جب صبح 3000 بچوں پر مشتمل اسمبلی ہوتی ہے تو اس اسمبلی میں تمام بچے اور اساتذۂ کرام اعلیٰ حضرت کی نعت سب سے اولیٰ و اعلیٰ ہمارا نبی، سب سے بالا و والا ہمارا نبی کے چند اشعار روزانہ ترانے کے طور پر پڑھتے ہیں۔ یہاں جب بھی کوئی محفل یا مجلس ہوتی ہے چاہے مدرسۂ عالیہ میں یا حضرت سید طیب شاہ القادری (المتوفی ۱۴۱۳ھ / 1992ء) کی تعمیر کردہ عالمگیر خانقاہ قادریہ سید یا طیبیہ میں محفل کا اختتام یا نبی سلام علیک کے بعد چند اشعار مصطفیٰ جانِ رحمت پر لاکھوں سلام ضرور ضرور پڑھے جاتے ہیں اس کے بعد دعائے خیر کی جاتی ہے۔

قارئین کرام! اس وقت یہ مدرسہ اور خانقاہ پورے بنگلہ دیش میں سب سے بڑی خانقاہ اور مدرسے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ۱۲ ربیع الاوّل کو 10 لاکھ سے زیادہ مجموعہ ہوتا ہے جس میں بیشتر کلام اعلیٰ حضرت کا ہی پڑھا جاتا ہے۔ اس خانقاہ اور مدرسے سے وابستہ ہر فرد اعلیٰ حضرت سے عشق کی حد تک محبت رکھتا ہے۔ یہ سب محبتیں حضرت سید احمد شاہ صاحب اور بعد میں حضرت سید طیب شاہ القادری کی امام احمد رضا سے از خود محبت اور عقیدت کا حسین اظہار ہے جب کہ موجودہ سجادہ نشین حضرت سید طاہر شاہ صاحب مدظلہ العالی بھی امام احمد رضا کی تعلیمات کا اسی انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں جس طرح ان کے والد اور ان کے دادا حضور نے اپنے مدرسے اور خانقاہ میں تعلیماتِ رضا کو فروغ دیا۔ احقر کو اس عمل سے اس لیے خوشی زیادہ ہوئی کہ ان تینوں نسلوں کا امام احمد رضا یا ان کے صاحبزادگان سے نہ کوئی نسبتِ ظاہری ہے یعنی نہ کوئی خانقاہ قادریہ رضویہ میں مرید ہے نہ وہاں کا طالب علم ہے اور نہ ہی وہاں سے کسی کو بھی خلافت ملی مگر مسلکِ اعلیٰ حضرت چونکہ مسلکِ حق ہے اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا ترجمان ہے اس لیے ان حضرات نے تعلیماتِ رضا کو ہی بنیاد بنایا اور پورے بنگلہ دیش میں جہاں سب سے بڑی تعداد احمدیہ سنیہ کے طالب علموں کی ہے تو اسی طرح ارادت مندوں کی تعداد بھی سب سے زیادہ ہے اور یہ طالب علم اور ان خانقاہ سے وابستہ تمام مریدین اعلیٰ حضرت امام احمد رضا سے سچی محبت اور عقیدت رکھتے ہیں اور اب اس انجمن کے رحمانیہ احمدیہ سنیہ سے امام احمد رضا کے متعدد رسائل کا بنگلہ زبان میں ترجمہ شائع کیا جارہا ہے اور ہر سال امام احمد رضا کے صفر المظفر کے ماہانہ رسالے میں امام احمد رضا نمبر شائع کیا جاتا ہے۔

انجمن رحمانیہ احمدیہ سنیہ کے مورث اعلیٰ حضرت خواجہ شاہ عبدالرحمٰن چھوروی (المتوفی ۱۳۴۲ھ / 1924ء) اور ان کے مرید اور خلیفۂ اعظم حضرت سید احمد شاہ القادری بریلوی اور ان کے فرزند اور مرید و خلیفہ اجل حضرت پیر سید طیب شاہ القادری سریاکوٹی حضرات کی آرام گاہیں پاکستان کے صوبہ سرحد کے علاقہ ہری پور ہزارہ میں سریہ کوٹ کے مقام پر دربار عالیہ قادریہ میں ہیں مگر بنگلہ دیش میں ان کے مدارس، خانقاہیں اور ادارہ سینکڑوں کی تعداد میں آج مصروفِ عمل ہیں اور ان بزرگوں کا فیض بنگلہ دیش میں اس طرح نظر آتا ہے کہ یہ بزرگانِ دین جو بنگلہ دیش میں آرام فرمارہے ہوں ایسی مثال دنیا میں کم ملے گی کہ ۲ ہزار میل دور سے صاحبانِ قبر وہاں اپنے تمام اداروں کی روحانی سرپرستی فرمارہے ہیں۔ یہ باطنی نفس کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ بزرگانِ دین صوبہ سرحد میں آرام فرماں ہیں، جن کی تعلیمات کو فروغ دیا جارہا ہے وہ بریلی میں آرام فرما ہیں اور ان سب کا فیض بنگلہ دیش میں جاری و ساری ہے۔ احقر کی نظر اسی خانقاہ کے شجرہ شریف پر بھی پڑی تو دیکھا کہ تمام اذکار کے ساتھ ساتھ شجرہ شریف میں سب سے پہلے اعلیٰ حضرت کی مشہورِ زمانہ نعت سب سے اولیٰ و اعلیٰ ہمارا نبی اور منقبتِ غوث پاک:

تو ہے وہ غوث کہ ہر غوث ہے شیدا تیرا
تو ہے وہ غیث کہ ہر غیث ہے پیاسا تیرا

بھی شامل ہے اور شجرے کے آخر میں مصطفیٰ جانِ رحمت پہ

لاکھوں سلام کے بھی اشعار موجود ہیں یہ شجرہ احقر کو جامعہ احمد یہ سنیہ کے پرنسپل محترم المقام مولانا جلال الدین القادری نے پیش کیا جب کہ اسی ادارے سے نکلنے والے ماہنامہ "ترجمان اہلِ سنّت" کے چیف ایڈیٹر اور مترجم قرآن کنزالایمان بزبان بنگلہ حضرت علامہ مولانا محمد منان صاحب نے احقر کو حضرت عبدالرحمٰن چھوروی کی مشہورِ زمانہ کتاب "صلوات الرسول" کی ۳ جلدیں عطا کیں۔ یہ مجموعۂ درود حضرت کی انوکھی تصنیف ہے۔ ان درود کو ۳۰ پاروں کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے اور ہر پارے کا الگ عنوان ہے اور اس عنوان کے تحت حضور ﷺ کی تعریف وتوصیف عربی زبان میں بیان کی گئی ہے جب کہ حضرت کے علوم کے متعلق مشہور ہے کہ آپ علم میں امی تھے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو علم لدنی عطا کیا جن کا مظاہرہ آپ نے ۳۰ پاروں پر مشتمل درود کی کتاب "صلوات الرسول" لکھ کر کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی خدماتِ عالیہ کو اور ان اداروں کے بانیان کی خدمات کو اپنی پاک بارگاہ میں قبول ومقبول فرمائے اور موجودہ سجادہ نشین حضرت پیر سید طاہر شاہ صاحب اور سید حاجر شاہ صاحب کی عمر وصحت میں برکتیں عطا فرمائے تاکہ مسلکِ اعلیٰ حضرت نہ صرف بنگلہ دیش بلکہ پورے برصغیر میں اور عالم اسلام میں مزید ترقی حاصل کرے۔

بنگلہ دیش میں ایک اور شخصیت مولانا سید محمد عزیز الحق القادری شیر بنگال علیہ الرحمۃ کے نام سے مشہور ہے جن کا مزار مبارک چاٹگام میں مرجع خلائق ہے۔ بنگلہ دیش میں نہ صرف عوام بلکہ علمائے اہلِ سنّت آپ کو امام اہلِ سنّت، شمس المناظرین، فخر الواعظین جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ آپ بدمذہب لوگوں کو کھلا چیلنج دیا کرتے تھے کہ جو عبارتیں امام احمد رضا نے گرفت کی ہیں ان کا جواب طلب کرتے اور وہ جب جواب نہ دے پاتے ان کو شہر بدر کر کے دم لیتے۔ غالباً 1955ء کے قریب کی بات ہے ایک موقع پر جماعت اسلامی کے بانی چاٹگام تشریف لائے اور ایک جلسے سے خطاب کے لیے جب وہ اسٹیج پر پہنچے تو شیر بنگال نے انھیں للکارا اور ان سے ان کی کفری عبارتوں کا جواب طلب کیا اور یہ کہا کہ جب تک جواب نہ دیں گے آپ کو خطاب نہیں کرنے دیا جائے گا۔ وہ صاحب یعنی بانیِ جماعت اسلامی اسٹیج چھوڑ کر بھاگ گئے مگر ان کے حامیوں نے حضرت کو بہت مارا یہاں تک کہ ڈاکٹروں نے سرٹیفیکٹ دے دیا کہ حضرت وصال پاچکے۔ لوگوں نے حضرت کی تدفین کی تیاریاں شروع کر دیں مگر چند گھنٹے کے بعد حضرت بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے میری زندگی کی دعا کے لیے کہا اور جیسے ہی حضور ﷺ نے دعا فرمائی اللہ تعالیٰ نے مجھے زندگی دوبارہ واپس لوٹا دی لہٰذا اب میں دعائے فاطمہ کے سہارے زندہ ہوا ہوں۔

احقر جب آپ کی مرقد پر حاضر ہوا تو آپ کے صاحبزادے مولانا امین الحق القادری اور آپ کے نواسے سے ملاقات ہوئی جو خانقاہ اور جامعہ عزیزیہ قادریہ کی ذمے داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ حضرت کے مزارِ مبارک کے متعلق معلوم ہوا کہ حضرت نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کی قبر کو ان کے قد کے برابر کھودا جائے تاکہ جب حضور ﷺ کی زیارت کرائی جائے تو میں کھڑا ہو کر ان کا استقبال کروں اور صلوٰۃ وسلام پیش کروں اور آپ نے یہ امام احمد رضا کی سنت کے مطابق وصیت فرمائی کہ اعلیٰ حضرت نے اپنی وصیت میں اسی محبت کا اظہار کیا تھا۔ حضرت عزیز الحق کو امام احمد رضا سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا آپ کی زبان پر اکثر اعلیٰ حضرت کے نعتیہ اشعار رہتے اور آپ بدمذہب لوگوں کو ہمیشہ للکارتے اور اعلیٰ حضرت نے جن جن عبارتوں پر گرفت فرمائی تھی ان کا جواب ان سے طلب کرتے اور اعلیٰ حضرت کے ان کے خلاف فتووں کا خوب پرچار کرتے اس کا اثر آج تک قائم ہے اور آپ کے نواسے مولانا محمد نعیم الحق بدمذہبوں کا اسی شدت سے رد کرتے ہیں جیسا ان کے نانا جان کیا کرتے تھے۔ خانقاہ اور مدارس میں امام احمد رضا کا نام ہر وقت زبانوں پر جاری رہتا ہے۔

حضرت شاہ سید محمد عزیز الحق القادری علیہ الرحمۃ کا دیوان عزیز بزبان فارسی نظر سے گزرا جس میں حضرت کے حمد ونعت کے علاوہ عرب وعجم کے متعدد اولیائے کرام اور پاکستان وہندوستان کے اولیا کے علاوہ بنگلہ دیش کے کثیر علما ومشائخ کی مناقب تحریر فرمائی ہیں۔ ان مناقب کی تعداد دیوان عزیز میں 300 سے زیادہ ہے اس میں امام احمد رضا علیہ الرحمۃ پر لکھی گئی منقبت کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

در مدح امام اہلِ سنّت مجدد و ملّت حامی سنت قامع بدعت پیشوائے عالماں مقتدائے فاضلاں بقیۃ السلف حجۃ الخلف صاحبِ تصانیف کثیرہ، مقامات عالیہ شیخ الاسلام فخر الہند حضرت علامہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی علیہ رحمۃ ربہ الباری

مرحبامد مرحبا صد مرحبا صد مرحبا
از برائے فخر ہند احمد رضا خاں مرحبا
مقتدائے اہلِ سنّت بودآں رشک زماں
صاحب تالیف وتصنیفات آمد بے گماں
دافع کفر و ضلالت رہبر راہ ہدیٰ
عہد حاضر را مجدداں امام احمد رضا
گرنہ بودے ذاتِ پاکش اندر آں ہندوستان
دشمن احمد وہابیاں شدندے اہلِ آں
نعمت عظمیٰ برائے اہلِ سنّت بے گماں
زہر قاتل بود لیکن ازبرائے دیبیاں
زبنش راباغ جنت سازای رب جہاں
استجب یارب طفیل سرورے پیغمبراں
در بریلی کشت واقع روضہ پر نور او
مردماں فیض باشد دائماں ازذات او
نام ناظم گر تو خواہی شیر بنگال بداں
منکران سنیاں راسیف براں گماں

(دیوان عزیز، ص۳۶۔۳۷)

راقم مولانا شاہد الرحمٰن ہاشمی کی دعوت پر ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا لیکن دولت کدے سے قریب ہی حضرت کے والد اور دادا حضور حضرت احسن الزماں ہاشمی کے مزار پر حاضر ہوں اور ان کے چچا امام اہلِ سنّت بقیۃ السلف حضرت مولانا نور السلام ہاشمی مدظلہ العالی کی زیارت اور ملاقات سے بھی مشرف ہوئے۔ حضرت بھی امام اہلِ سنّت امام احمد رضا کی تعلیمات میں اہم کردار ادا کررہے ہیں اور آپ کے بھتیجے محترم المقام مولانا شاہد الرحمٰن ہاشمی اور مولانا صادق الرحمٰن ہاشمی پورے بنگلہ دیش میں اپنے اسلاف کے نقشۂ قدم پر چلتے ہوئے مسلک اعلیٰ حضرت کو فروغ دینے میں مصروفِ عمل ہیں اور ہر سال اعلیٰ حضرت کا عرس بھی عالیشان طریقے سے مناتے ہیں۔

چٹاگانگ میں ۲ فروری ۲۰۱۱ء کو اسلامیہ ھال میں ایک عظیم الشان ۱۳ویں امام احمد رضا کانفرنس کا اہتمام اعلیٰ حضرت فاونڈیشن بنگلہ دیش کی جانب سے کیا گیا تھا، جس میں نہ صرف چٹاگانگ بلکہ بنگلہ دیش کے مختلف علاقوں کے اکابر علماو مشائخ اہلِ سنّت اور دانشوران ملت نے شرکت فرمائی جس کی تفصیل آپ مولانا بدیع العالم رضوی کی رپورٹ میں پڑھ سکتے ہیں۔ راقم کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ بنگلہ دیش کے کثیر علماو مشائخ کے درمیان یہ ناچیز مہمانِ اعلیٰ کی حیثیت سے مدعو تھا یہ سب فیضِ رضا کی برکتیں ہیں۔ یہ میرے لیے انتہائی خوشی کا مقام تھا کہ میری دائیں جانب حضرت شاہ سید محمد عزیز الحق شیر بنگال کے صاحبزادے محترم المقام مولانا محمد امین الحق القادری اور بائیں جانب استاذ العلما مفتی مولانا محمد ادریس رضوی تلمذِ رشید مولانا سردار احمد لائلپوری تشریف فرماتھے؛ جب کہ پہلی صف میں میرے دائیں اور بائیں جانب حضرت شیر ملت علامہ مفتی عبید الحق نعیمی شیخ الحدیث جامعہ احمدیہ سنیہ، مفکر اسلام اور مترجم قرآن بزبان بنگلہ مولانا محمد عبد المنان صاحب، علامہ قاضی معین الدین اشرفی، شیخ الحدیث سبحانیہ عالیہ، حضرت علامہ مولانا حافظ محمد سلیمان انصاری چیئرمین O.A.C، حضرت علامہ مولانا بدیع العالم رضوی چیئرمین اعلیٰ حضرت فاونڈیشن بنگلہ دیش، پیرِ طریقت مولانا ہارون الرشید رضوی صاحب ودیگر 50 سے زیادہ علماو اسکالرز حضرات تشریف فرماتھے۔ احقر نے ان سب کی موجودگی میں اور 3000 سے زائد عوام الناس کی موجودگی میں 2 گھنٹے تک امام احمد رضا کی تعلیمات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ امام احمد رضا کے سائنسی علوم پر بالخصوص روشنی ڈالی جس کو عوام نے بہت سراہا۔ احقر اس کا یوں اظہار کرتا ہے کہ:

(اے رضا) کام وہ لے لیجیے تم کو جو راضی کرے

الحمد للہ اس کامیاب کانفرنس کے بعد اگلے دن دو اور کانفرنسوں سے خطاب کرنے کا موقع ملا جہاں کثیر تعداد میں نوجوان عوام اہلِ سنّت کی شرکت نے متاثر کیا اور یہ خیال ذہن میں برابر آتا رہا کہ بنگلہ دیش کے علماو مشائخ نے عوام اہلِ سنت میں امام احمد رضا کی کتنی محبت وعقیدت جاں گزیں کردی ہے کہ جہاں امام احمد رضا کا ذکر کیا جاتا ہے وہاں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ جمع ہوجاتے ہیں اور وہ اعلیٰ حضرت کی باتوں اور کاموں کو بغور سنتے ہیں۔

قارئین کرام! آخر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان تمام احباب کا نام لے کر شکریہ ادا کروں جنھوں نے احقر کی عزت افزائی فرمائی اور بہت زیادہ احسن کلمات سے فقیر کا ذکر کیا ان سب میں نمایاں نام مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا بدیع العالم رضوی، مولانا محمد عبد المنان، مفتی عبید الحق نعیمی، علامہ حافظ محمد سلیمان انصاری، مولانا قاضی معین الدین اشرفی، مولانا ہارون الرشید رضوی، مولانا صادق الرحمٰن ہاشمی، مولانا شاہد الرحمٰن ہاشمی، مولانا مرشد الحق، مولانا سید وصی الرحمٰن، مولانا جلال الدین الازھری، پروفیسر ابوطالب بلال، مولانا ارشاد خطیبی، مولانا ظفر اللہ، حافظ محمد عثمان، مولانا برھان الدین، مولانا سید یونس رضوی، مولانا عبد الغفور، مولانا ابونصر طیب علی، مولاناحافظ انیس الزماں اور مولانا عبد اللہ، مولانا نظام الدین صاحب وغیرہ ہا۔

راقم الحروف مولانا بدیع العالم رضوی صاحب کے ان الفاظ کا انتہائی ممنون ہے کہ جو انھوں نے اپنے خط اور رپورٹ میں احقر سے متعلق لکھے ہیں اللہ تعالیٰ مجھے ان کے الفاظ کا آئینہ بنائے اور خدمتِ مسلک اعلیٰ حضرت آخری سانس تک جاری رہے تا کہ قیامت میں احقر اعلیٰ حضرت کا دامن تھامنے کے لائق ہوسکے تا کہ وہ احقر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کریں اور احقر کے لیے سفارشِ شفاعت فرمائیں۔ آمین۔

◈◈◈

---

(بقیہ صفحہ نمبر 24 سے ملحق)

سے پہلے نماز درست نہیں ہے، اور وقت گزرنے کے بعد (اس کی قضا) درست ہے، پھر کیسے نماز درست نہ ہوگی جبکہ بالاتفاق وقت باقی ہے "اھ۔ پھر فرمایا: "احتیاط یہ ہے کہ نمازِ ظہر، سائے کے ایک مثل ہونے سے پہلے پڑھ لے اور نمازِ عصر دو مثل کے بعد، تا کہ بالاتفاق (دونوں کو) ادا کرنے والا ہو جائے، اسی کی مثل مبسوط میں ہے" اھ۔ طحطاوی علی المراقی می ہے: "اسی کو جمہور علمائے حنفیہ نے صحیح کہا ہے"۔ اھ اور نقایہ میں فرمایا: "وقتِ ظہر زوال سے لے کر اس وقت تک ہے کہ جب سایۂ اصلی کے علاوہ ہر چیز کا سایہ اس کی دو مثل ہوجائے، اور ایک قول ایک مثل ہے" اھ۔ بے شک انھوں نے "ایک مثل" والی روایت کے ضعف کی طرف "ایک مثل" کے ضعف کو مقدم اور اسکی تعبیر "ایک روایت میں ایک مثل ہے" سے کرکے اشارہ کیا ہے۔ جامع الرموز میں فرمایا: "'دو مثل' کی تقدیم میں اس قول کے مفتیٰ بہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔اھ" اور فرمایا: "نہایہ میں ہے کہ احتیاط یہ ہے کہ عصر اس وقت تک ادا نہ کرے یہاں تک کے سایۂ اصلی کے علاوہ، ہر چیز کا سایہ اس کی دو مثل نہ ہو جائے۔اھ" اور ظہر کا وقت زوال سے لے کر سایۂ اصلی کے علاوہ، سائے کے دو مثل ہونے تک ہے، اسی کے مثل کافی میں ہے اور یہی صحیح ہے، اسی طرح محیط سَرخسیُ میں ہے۔ اھ "ہندیہ"۔ علما فرماتے ہیں: "احتیاط یہ ہے کہ ظہر، سائے کے ایک مثل ہونے سے پہلے پڑھی جائے، اور عصر، جب سایہ دو مثل ہو جائے تا کہ دونوں نمازیں یقین کے ساتھ اپنے اپنے وقتوں میں ادا ہوں، اور عصر کا وقت، سایۂ اصلی کے علاوہ، سائے کے دو مثل ہونے سے لے کر سورج غروب ہونے تک ہے، اسی کی مثل شرح مجمع میں ہے۔ اھ" ہندیہ۔ "مُلتقی" میں اس کو مقدم کیا اور یہ انھوں نے (اپنے خطبۂ کتاب میں) فرمایا ہے: "میں نے اقوالِ علما سے ارجح قول کو مقدم کیا ہے۔اھ" مجمع الانہر میں ہے: "یہی فتوے کے لیے مختار ہے۔اھ" مصنف کی شرح مجمع میں ہے کہ اس کو اصحابِ متون نے اختیار کیا ہے اور شارحین نے اس کو پسند کیا ہے۔ "بحر" اھ۔ طحطاوی علی الدر۔

شیخ الاسلام اِسبِیجَابی نے فرمایا: "احتیاط یہ ہے کہ عصر اس وقت تک نہ پڑھے جب تک سایہ دو مثل نہ ہو جائے تا کہ بالاجماع نماز ادا کرنے والا ہو جائے، اسی طرح سراج میں ہے۔اھ" مخلصاً، طحطاوی و بحر۔ اور مصنف کی "شرح مجمع" میں ہے کہ یہی مذہب ہے، اور "سراج منیر" میں ہے کہ اور اسی قول پر فتویٰ ہے، اور "حمادیہ" میں "حاشیۂ منظومہ" سے ہے کہ اور جس قول پر فتویٰ ہونے کا تعلق ہے تو وہ فتاوٰی ظہیریہ میں مذکور ہے کہ "لازم ہے کہ ظہر کو اتنا مؤخر نہ کرے کہ ہر چیز کا سایہ اسکی مثل ہو جائے، اور عصر اس وقت تک نہ پڑھے جب تک ہر چیز کا سایہ دو مثل نہ ہو جائے،" نفع المفتی لکھنوی۔

**میں کہتا ہوں:** جب علما نے دو مثل میں ظہر ادا کرنے کی کراہت کا ذکر کیا ہے، تو اس میں عصر کی ادائیگی بدرجۂ اولی سخت و عظیم کراہیت کا باعث ہوگی، کیونکہ پہلی صورت میں اختلاف حلت و حرمت کا ہے جبکہ یہاں نماز کی صحت اور بطلان کا۔

**قولہ:** اور اس کو اصحاب متون نے اختیار کیا ہے:

**قال الرضا:** جیسے کنز الدقائق، وقایہ اور وافی میں۔

**قولہ:** اور شارحین نے اسے پسند کیا ہے:

**قال الرضا:** جیسے زیلعی نے۔

✦ ✦ ✦ ✦ ✦

# اسلامی شعار

**(از تبرکاتِ محدث اعظم پاکستان مولانا محمد سردار احمد قادری چشتی)**

**مرتب: مولانا محمد جلال الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ**

سراج المحدثین قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین سند الصالحین مولانا و مرشدنا الحاج ابو الفضل محمد سردار احمد محدثِ اعظم پاکستان قدس سرہ العزیز کے ذاتی کُتب خانے میں قلمی مسودات میں ''فتوح الشام'' للامام الواقدی قدس سرہ کے ابتدائی اوراق پر آپ کے قلمِ مبارک کے چند حوالہ جات موجود ہیں۔ حسبِ عادت شریفہ اپنی ذاتی کتابوں کے ابتدائی اوراق میں متعلقہ کتاب کے فوائد درج فرمادیتے۔ علاوہ ازیں ایک بیاض میں انھی حوالہ جات کو بطورِ یاد داشت آپ نے درج فرمادیا۔ ان حوالہ جات کا موضوع ''اسلامی شعار'' ہے۔ اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر بکثرت حوالہ جات موجود ہیں۔ راقم الحروف فقیر قادری عفی عنہ الباری نے حضرت صاحبزادہ والا شان پیر طریقت رہبر شریعت مولانا پیر محمد فضلِ رسول حیدر رضوی مدظلہ العالی کی اجازت سے ان حوالہ جات سے استفادہ کرتے ہوئے شعارِ اسلامی کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ (مرتب) یہ جائزہ دراصل ان تعلیمات رضا کا عکس ہیں جو حضرت شیخ الحدیث تک تلامذہ امام احمد رضا کے ذریعے پہنچیں۔ (عبید)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

ہر قوم ہر جماعت، ہر فوج، ہر قبیلہ اور ہر تنظیم کی ایک علامتِ مخصوصہ ہوتی ہے۔ اسی علامتِ مخصوصہ سے وہ دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے۔ عرف اور اصطلاح میں اس علامت کو ''شعار'' کہتے ہیں۔ شعار میں درجِ ذیل امور شامل ہوتے ہیں: وَردی، نشان، علامت، اشارہ، عادت، اسم، طریقہ، قاعدہ، نعرہ اور پرچم وغیرہ۔

شعار کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ ہر جماعت یا گروہ کا احساسِ تشخص۔ جب کسی جماعت، گروہ یا مجموعۂ افراد کو احساس ہوا کہ وہ دوُسروں سے الگ ہیں، اُنھوں نے اپنے امتیاز کے لیے کوئی علامت اپنالی۔ رفتہ رفتہ وہی علامت اس جماعت کی پہچان بن گئی۔ اگر کوئی جماعت من حیث الجماعت زندہ رہنے کی خواہش مند ہو تو وہ اپنے شِعار کی حفاظت کرتی ہے۔ شعار اور علامتِ مخصوصہ کا بقا اس جماعت کی بقا کا ضامن ہے۔ اِس لیے ہر جماعت اپنے شعار کی حفاظت دِل و جان سے کرتی ہے اور اس کے تحفظ کے لیے ہر ممکنہ قربانی سے دریغ نہیں کرتی۔ شعار اگرچہ ایک معمولی علامت ہوتی ہے۔ بہ نظر ظاہر اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی مگر کسی قوم کے اپنا لینے کے بعد وہ قوم اس شعار کی حفاظت اس طرح کرتی ہے جس طرح وہ اپنی جان، مال، عزت و آبرو کی، بلکہ اس شعار کی حفاظت میں مَال، جان، عزّت و آبرو کی قربانی روا ہوتی ہے۔

پرچم ہر قوم اور جماعت کے شِعار میں شامل ہے۔ پرچم کی ہیئتِ ترکیبی کپڑے کے ایک ٹکڑے سے ہوتی ہے، مگر پرچم بن جانے کے بعد وہ قوم کی عزت و آبرو کی علامت ہے۔ پرچم بلند ہے تو قوم سر فراز ہے پرچم کے سَرنگوں ہونے میں قوم کی شکست اور افسردگی نمایاں ہے۔ کوئی قوم اپنے قومی پرچم کی تذلیل جیتے جی برداشت نہیں کرسکتی۔ قوم کی روایات کے علاوہ اس قوم کا آئین اس کا محافظ ہوتا ہے۔ اسی طرح چند مختصر اور مخصوص الفاظ اس قوم کا نعرہ اور ترانہ ہوتے ہیں۔ اس کی حفاظت بھی قومی فریضہ ہے۔ تاریخِ اِسلام میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں کہ مُسلمانوں نے اپنے پرچم کی حفاظت میں جان کا نذرانہ پیش کیا۔ قرونِ اولیٰ بلکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اُسوہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ غزوۂ موتہ میں پرچم اسلام کی سر بلندی کے لیے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں بازوؤں کا نذرانہ پیش کیا حتیٰ کہ جامِ شہادت نوش کر کے دربارِ رسَالت سے ''طیار'' کامبارک لقب حاصل کیا۔ ہر قوم اپنے قومی شعار پرچم کی عزت دل و جان سے عزیز رکھتی ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ کوئی قوم اپنی سر زمین پر دوسری قوم کے پرچم کو وہ اعزاز نہیں دیتی جو اس کے اپنے قومی پرچم کا اعزاز ہوتا ہے۔ اتفاق سے اگر کسی قوم یا قوموں کے پرچم اس کے قومی پرچم کے ساتھ لہرانے کا وقت آجائے تو وہ اپنے پرچم کو سَب سے بلند نصب کرتی ہے۔ اگرچہ یہ قوم یا ملک

دُوسروں سے کتناہی چھوٹا یا کمزور کیوں نہ ہو۔ قومی پرچم کا یہ اعزاز اس کے شعارِ قومی کا اعزاز ہے جو ہر قیمت پر اسے عزیز ہے۔فاتحِ قوم مفتوحہ علاقوں پر اپنے قومی پرچم کو نصب کرکے اپنی بَرتری کا اعلان کرتی رہے۔ مفتوحہ علاقوں پر جب تک قومی شعار، پرچم سربلند ہے وہ علاقہ فاتح کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ گویا قبضہ و ملک کی علامت قومی شعار کی سربلندی میں ہے۔ قومی پرچم کے رنگ، رنگوں میں تناسب، حجم، سَائز اور ڈیزائن میں تبدیلی آسانی سے ممکن نہیں۔ قوم کا کوئی فرد اپنے طور پر اس میں تبدیلی کا مجاز نہیں۔اگرچہ اس کا مجوزہ ڈیزائن کتنا ہی خوبصورت اور مناسب کیوں نہ ہو قوم کے اربابِ حل وکشاد اگر اتفاقِ رائے سے تبدیلی چاہیں تو ممکن ہے بصورت دیگر جمہور کی آواز اس راہ میں حائل ہوگی۔ یہی حال قومی ترانہ کا ہے قومی ترانہ اگرچہ چند الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے ممکن ہے کوئی ادیب یا شاعر اس سے بہتر الفاظ کو ترتیب دے لے۔ کوئی نظم اس سے بہتر کہہ لے مگر وہ اس طے شدہ قومی ترانہ کا بدل نہیں ہوسکتی۔ قوم کے جمہور افراد اور نمائندہ اربابِ حل وکشاد کی تائید کے بغیر اس قومی ترانہ میں تبدیلی ممکن نہیں۔ یہ صورتِ حَال بھی قومی شعار کی حفاظت کے باعث ممکن ہے۔ قومی پرچم اور قومی ترانہ اگرچہ وحی سے حاصل نہیں ہوئے اور نہ ہی وحی نے ان کی تائید کی ہے مگر قوم کی علامت بن جانے سے ان کی حفاظت اور عزت لازمی ہوگئی ہے۔ قومی شعار کے بارے میں یہ اُصول ہمیشہ یاد رکھنے کا ہے۔ قومی شِعار خواہ الفاظ ہوں یا علامات ان کے بارے میں وحی یا کسی شرعی نص کا مطالبہ بلا جواز ہے۔ جمہور کا اختیار ہی اس کے جواز کی سند ہے۔

گزشتہ سطور میں بیان ہوچکا ہے کہ شِعار نعرہ، علامت، پرچم وغیرہ سبھی کو شامل ہے۔ بعض اوقات ایک دھاگا یا کپڑے کا ٹکڑا قومی شعار ہوتا ہے۔ہنود بے بہبود کا شِعار زُنّار ایک معمولی دھاگا ہے۔ نصاریٰ اپنے لباس میں قومی شعار صلیب بنانے کے لیے کپڑے کے حقیر ٹکڑے کو استعمال کرتے ہیں جسے وہ "ٹائی" کا نام دیتے ہیں۔یہود دوہری مثلث سے چھ کونوں پر مشتمل ایک ستارے کو قومی شعار بنا بیٹھے ہیں۔ بعض اوقات صِرف رنگ ہی شعار کا کام دیتا ہے۔ یہودی جس غیر یہودی کو یہودیت میں داخل کرتے ہیں تو اس کو زرد رنگ کا لباس پہناتے ہیں۔شعار کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی مالیت سے نہیں بلکہ اس کی قدر و منزلت سے ہوتا ہے۔ زُنّار ایک بے وَقعت دھاگا ہے مگر زُنّار کی قدر و قیمت ہنود کی نگاہ میں کیا ہے اس کا جواب وہی دے سکتا ہے۔ ٹائی بننے سے پہلے کپڑے کے ٹکڑے کی قیمت کچھ بھی نہیں۔ ٹائی کی مخصوص ہیئت کے بعد نصاریٰ کے اس قومی شعار کی قدر و قیمت حد و حساب سے باہر ہے۔ یہی حال ہمارے اسلامی شعار کا ہے۔ قومی شعار میں ہر قوم کی مذہبی روایات شامل ہوتی ہیں۔ عقیدہ اور روایات کو علامتی طور پر باقی اور محفوظ رکھنے کے لیے شعار بنائے جاتے ہیں۔ گویا شعار کی حفاظت قومی روایات اور معتقدات کا تحفظ ہے۔ ہر قوم اور ہر جماعت مقام، زمانہ اور حالات کی تبدیلی سے قومی شعار میں تبدیلی کرلیتی ہے۔ تبدیل شدہ قومی شعار بظاہر ایک نئی شے نظر آتی ہے مگر درحقیقت بنیادی نظریے کی مختلف علامات کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اقتصنائے حال سے یہ تبدیلی ہر دور اور ہر علاقے میں ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی ممکن ہے۔ معرکہ ہائے جنگ میں ہر مرتبہ شعار بدل دیا جاتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فریقِ مخالف پرانا شعار استعمال کرکے دھوکا دے سکتا ہے۔ اس ممکنہ دھوکے سے محفوظ رہنے کے لیے ذمہ داران سپہ سالار شعار کو بدل لیتے ہیں تاکہ ہر قدم پر فریق مخالف سے امتیاز قائم رہے۔

شعار کی مزید وضاحت کے لیے لُغت کی طرف توجہ مُفیدِ مطلب ہے۔ علامہ احمد بن محمد بن علی المقری القیومی (م ۷۷۰ھ) لکھتے ہیں: "والشعار ایضا علامة القوم فی الحرب وھوینا دون به لیعرف بعضھم بعضاو العید شعار من شعائر الا سلام۔" [۱] (ترجمہ جنگ میں کسی قوم کی علامت "شعار" کہلاتی ہے۔ اس شعار سے وہ قوم اپنے افراد کو ندا دیتے ہیں۔ اسی شعار سے وہ ایک دوسرے کو پہنچانتے ہیں اور عید اسلامی علامات میں ایک علامت ہے۔) مشہور عربی لغت "المنجد" کے اُردو ترجمے میں ہے: "الشعار: خاص لفظ جو فوج میں مقرر ہوتا ہے اور جس سے اپنے آدمیوں کو پہچانا جاتا ہے اور لڑائی کے وقت اس لفظ سے ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ اس کو "سِرّ اللیل" بھی کہتے ہیں۔" [۲] علمائے لغت نے فیصلہ کردیا کہ شعار کا استعمال اگرچہ بنیادی طور پر میدانِ جنگ میں ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر فوج کے افراد اس سے ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں اور اس کے استعمال سے فریقِ مخالف چونکہ ناواقف ہوتا ہے۔ اس

لیے وہ اسے استعمال نہیں کرتا۔ ساتھ ہی عید کے اسلامی شعار ہونے کی تصریح کرکے واضح کردیا کہ اسلامی شعار میں اسلامی روایات اور نظریات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے اپنی تصنیف "انفس الفکر فی قربان البقر" (۱۲۹۸ھ) کی ابتدا میں چند اصول بیان فرمائے ہیں۔ اختصار سے ان اُصولوں کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس سے مقاصدِ شرع اور احکامِ شرع کا مقام واضح ہو جائے گا۔ "ہماری شریعتِ مطہرہ اعلیٰ درجۂ حکمت و متانت و مراعات دقائقِ مصلحت میں ہے اور جو حکم عرف و مصالح پر مبنی ہوتا ہے انھیں چیزوں کے ساتھ دائر رہتا ہے اور اعصار و امصار میں ان کے تبدل سے متبدل ہو جاتا ہے اور وہ سب احکام احکامِ شرع ہی قرار پاتے ہیں۔"[۳] پھر اس اُصول کو ایک مثال سے واضح کیا کہ زمان برکت نشان حضور سرورِ عالم ﷺ میں بوجہ کثرت خیر و نایابی فتنہ و شدّتِ تقویٰ و قوت خوف خدا عورتوں پر ستر وحجاب واجب نہ تھا۔ زنانِ مسلمین پنجگانہ نماز مساجد میں حاضر ہو کر جماعت سے ادا کرتی تھیں۔ بعد میں جب زمانہ کا رنگ قدرے متغیر ہوا۔ اُم المومنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: لوان رسول الله ﷺ رای من النساء ما را بنا لمنعهن من المسجد كما منعت بنواسرائیل نساء ها۔ "یعنی رسول اللہ ﷺ ہمارے زمانے کی عورتوں کو ملاحظہ فرماتے تو انھیں مساجد جانے سے ممانعت کرتے جیسے بنی اسرائیل نے اپنی عورتوں کو منع کر دیا تھا۔ رواہ احمد والبخاری وسلم۔"[۴] "جب زمانۂ رسالت سے اور بعد ہوا۔ ائمہ دین نے جوان عورتوں کو ممانعت کر دی۔ جب اور فساد پھیلا علمانے جوان اور غیر جوان کسی کے لیے اجازت نہ رکھی۔"[۵] اُصول اور مثال بیان کرکے امام احمد رضا قدس سرہ نے فرمایا: "ان ائمہ و علما کے یہ احکام ہرگز حکمِ اقدس کے خلاف نہ ٹھہرے بلکہ عین مطابق مقصود شرع قرار پائے۔"[۶]

قواعدِ شرعیہ میں سے ایک اور اُصول کی وضاحت میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ نے فرمایا: "واجبات و محرمات ہماری شریعت میں دو قسم ہیں۔ ایک لعینہ یعنی جس کی نفس ذات میں مقتضی ایجاب و تحریم موجود ہے۔ جیسے عبادت خدا کی فرضیت اور بُت پرستی کی حرمت۔ دوسری لغیرہ یعنی وہ کہ امور خارجہ کا لحاظ ان کی ایجاب و تحریم کا اقتضا کرتا ہے۔ اگرچہ نفس ذات میں کوئی معنی اس کو مقتضی نہیں"۔[۷] اس اصول کی وضاحت میں آپ نے دو مثالیں دیں۔ ایک مثال جانب ایجاب میں، دوسری جانب تحریم میں۔ فرمایا کہ علم صرف و نحو کا پڑھنا اور انگرکھے کا سیدھا پہننا نفس علم صرف و نحو میں ایجاب کا پہلو نہیں مگر چونکہ قرآن مجید اور ہمارے نبی پاک صاحبِ لولاک ﷺ کا کلام عربی میں ہے۔ اس کو سمجھنا واجب ہے اور اس کا سمجھنا صرف و نحو کے بغیر ممکن نہیں اس اقتضائے حال کی وجہ سے صرف و نحو کا علم پڑھنا واجب ہے۔ اسی طرح غیر منقسم ہندوستان میں سیدھا انگرکھا پہننا مسلمانوں کا شعار۔ تو اب ہمارے علاقہ میں سیدھا پردہ چھوڑ کر اُلٹا اختیار کرنا حرام ہے۔[۸]

اِسلامی شعار کے تحفظ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے امام احمد رضا قدس سرہ نے ایک قاعدہ کلیہ بیان فرمایا: "بوجہ صرف و قرار داد امصار و بلاد جس مباح کا فعل عزت و شوکت اسلام پر دلالت کرے اور اسے چھوڑدینے میں اسلام کی توہین اور کفر کا غلبہ سمجھا جائے۔ قواعدِ شرعیہ بالیقین اُس بازرہنے کی تحریم کرتے ہیں اور مبنی اس کا وہی مصالح و اعتبار عزت و مراعات اقتضائے امورِ خارجہ ہے۔"[۹] یعنی اگر کسی فعل مباح جس کا کرنا صرف جائز ہو، نہ کرنے میں مواخذہ شرعیہ نہ ہو، میں عزت اسلام اور شوکت مسلمین ہو تو اُس فعل مباح کا کرنا واجب بن جاتا ہے اور اس کا ترک کرنا حرام ہوتا ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں گائے کا ذبح کرنا ہمیشہ سے وجہ نزاع رہا ہے۔ اگرچہ گائے کی قُربانی صرف مباح ہے۔ اس کے علاوہ اُونٹ، بھینس، بکری اور بھیڑ کی قُربانی بھی کی جاسکتی ہے۔ بالتعین کسی جانور کی قربانی واجب نہیں۔ اسی طرح عام حالات میں گائے کا ذبح کرنا مباح ہے۔ صرف گائے کی قربانی یا اسے ذبح کرنا واجب نہیں۔ مگر چونکہ ہندوؤں کے خوف سے ذبح گائے کے ترک کرنے میں اسلام پر ہنود کا غلبہ متصور ہے اسی وجہ سے قواعدِ شرعیہ ذبح گاؤ کے ترک کی اجازت نہیں دیتے مسلمانوں پر واجب ہے کہ جہاں ہندو انھیں ذبح گاؤ یا قربانی گاؤ سے منع کردیں وہ گائے کی قربانی کرکے شوکتِ اسلام اور عزت مسلمین کا تحفظ کریں۔[۱۰]

اس سلسلے میں امام احمد رضا قدس سرہ جیسے حکیم و فقیہ کا نکتۂ نظر ملاحظہ ہو: "ہم ہر مذہب و ملت کے عقلا سے دریافت کرتے ہیں کہ

اگر کسی شہر میں بزورِ مخالفین گاؤ کشی قطعاً بند کردی جائے اور بلحاظِ ناراضیِ ہنود اس فعل کو کہ ہماری شرع ہرگز اس سے باز رہنے کا ہمیں حکم نہیں دیتی یک قلم موقوف کیا جائے تو کیا اس فعل میں ذلت اسلام متصور نہ ہوگی۔ کیا اس میں خواری و مغلوبیِ مسلمین نہ سمجھی جائے گی۔ کیا اس وجہ سے ہنود کو ہم پر گردنیں دراز کرنے اور اپنی چیرہ دستی پر اعلیٰ درجے کی خوشی ظاہر کرکے ہمارے مذہب و اہل مذہب کے ساتھ شماتت کا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ کیا بلاوجہ وجیہ اپنے لیے ایسی دنات و ذلّت اختیار کرنا اور دوسروں کو دینی مغلوبی سے اپنے اُوپر ہنسوانا ہماری شرع مطہر جائز فرماتی ہے؟ حاشا و کلا حاشا و کلا، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ ہماری شرع ہرگز ہماری ذلت نہیں چاہتی۔"[11]

غیر منقسم ہندوستان میں ذبح گاؤ کی بات چل نکلی تو اس سلسلے میں دیگر علماء کے فتاویٰ ملاحظہ ہوں۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی لکھتے ہیں: "گائے ذبح کرنا اگرچہ مباح ہے، واجب نہیں۔ مگر ایسا مباح نہیں کہ کسی زمانے یا بلادِ خاص میں اس کا رواج ہو بلکہ یہ طریقۂ قدیمہ ہے۔ آنحضرت ﷺ وصحابہ و تابعین وجملہ سلف صالحین (رضی اللہ عنہم) سے تمام بلاد و امصار میں اور اس کی اباحت پر اجماع ہے تمام اہلِ اسلام کا ایسے امر شرعی ماثور قدیم سے اگر ہنود روکیں تو مسلمان کو اس سے باز رہنا درست نہیں ہے بلکہ ہر گاہ ہنود ایک امر شرعی قدیم کے ابطال میں کوشش کریں۔ اہل اسلام پر واجب ہے کہ اس کے ابقا و اجرا میں سعی کریں۔ اگر ہنود کے کہنے سے اس فعل کو چھوڑیں گے، گناہ گار ہوں گے۔"[12] مولوی ابوالحیا محمد عبدالحلیم لکھتے ہیں: "جن بلاد و مواضعات ہند میں رواج گاؤ کشی چلا آیا ہے اب کوئی ہنود بپاس تعصب مانع ہے۔ مسلمانوں کو بپاس حمیتِ اسلامی ابقائے گاؤ کشی میں کوشش بلیغ لازم ہے زینہار ترک نہ کریں۔ گاؤ کشی شعارِ مسلمانی ہے احتمالِ فساد ہو تو بذریعہ حکام رفع کرنا اس کا اُس کا بابقائے رواج قدیم واجب ہے بخوفِ فسادِ ہنود ذبح گائے سے زینہار باز نہ رہیں۔ ذبح گاؤ شعائرِ اسلام سے ہے اہمال اس کا بلاوجہ وجیہہ جائز نہیں۔"[13] مولوی محمد عبدالوہاب لکھتے ہیں: "فی الواقع ان بلاد میں مسلمانوں کو گاؤ کشی باقی رکھنے میں کوشش لازم ہے"[14] مولوی ابوالحسنات محمد عبدالحی، مولوی ابوالحیا محمد عبدالحلیم، مولوی عبدالوہاب مولوی ابوالغنا محمد عبدالمجید، مولوی ابوالاحیا محمد نعیم اور مولوی ابوالکرم محمد اکرم نے فتویٰ دیا۔ قربانی گائے کی شعارِ اسلام ہے۔ اس کا موقوف کرنا بہ سبب ممانعتِ ہنود معصیت ہے"۔[15] مولانا مفتی محمد مظہر اللہ امام مسجد جامع فتح پوری دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فتوے کا خلاصہ یوں ہے: "گائے کی قربانی دینِ الٰہی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔۔۔ ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ ہر ممکن کوشش سے اس نشان کی محافظت کریں کہ اس سے لاپرواہی عقاب الٰہی کا موجب اور عقاب الٰہی کا خوف اس کی محافظت کا سبب ہے۔۔۔ جس طرح گائے کا ذبیحہ اسلامی نشان ہے یوں ہی اس کا بند کرنا کفری نشان ہے۔ پس اس کی بندش کا اقدام تو بڑی شے ہے اس کی جانب قلب کا میلان بھی عذاب نار کا موجب ہے۔"[16]

درج بالا حقائق سے معلوم ہوا کہ جس زمانے یا جس شہر میں اسلام کے کسی مباح پر قدغن لگانے کی کوشش کی جائے وہاں اس مباح پر عمل واجب ہو جاتا ہے اور وہ مباح اس زمانے یا شہر میں شعارِ اسلام بن جاتا ہے۔ پاکستان سمیت جن علاقوں میں گائے کی قربانی پر قدغن نہیں وہاں ذبیحۂ گاؤ واجب نہیں اور جن علاقوں میں ہنود وغیرہ مسلمانوں کو اس سے روکیں وہاں ذبیحۂ گاؤ واجب ہے۔ گویا کسی امر مباح کے شعارِ اسلام بننے میں حالات اور مقامات کے اختلاف کو دخل ہے۔

گزشتہ سطور میں جو اصول اور قواعد بیان ہوئے ان کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم چند اسلامی شعار کا تذکرہ کرتے ہیں۔ غزوۂ احد میں جب لشکرِ اسلام کا مقابلہ مشرکین اور کفار کی فوج سے ہوا تو اس وقت لشکرِ اسلامی کا شعار اللہ تعالیٰ کی توحید کا نعرہ تھا۔ بخاری شریف میں ہے: "قال ابو سفیان اعل ھبل: فقال النبی ﷺ اجیبوہ قالوا: مانقول قال: اللہ اعلی واجل، قال ابو سفیان: لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم، فقال النبی ﷺ اجیبوہ! قالوا: مانقول، قال: قولوا اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم۔"[17] ابو سفیان بولا: اُعْلُ ھُبَل (اے ہبل بلند ہو) حضورِ اکرم نورِ مجسم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا "تم اس کا جواب دو۔" صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے عرض کیا، "جواب میں کیا کہیں" فرمایا تم کہو "اللہ اعلیٰ واجل" (اللہ تعالیٰ اعلیٰ اور بزرگ ہے) ابو سفیان بولا: لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم (ہمارا معبود عزّیٰ ہے اور تمہارے پاس کوئی عزّیٰ نہیں) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجاہدینِ اسلام سے فرمایا کہ "تم اس نعرے کا جواب دو" صحابہ نے

عرض کی ''ہم کیا جواب میں کہیں'' فرمایا تم کہو: اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم (اللہ تعالیٰ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں)۔ شرک کے مقابلے میں نعرۂ توحید شعارِ اسلام بنا کیونکہ اس وقت مشرکین کی طرف سے توحید ذاتِ باری کا انکار ہو رہا تھا۔ توحید کا اثبات اس بات کا متقاضی تھا کہ نعرۂ توحید شعار بنے۔ چنانچہ حضورِ اکرم ﷺ کی تعلیم سے وہی شعار بنا۔ سن ۷ھ میں سریہ میفعۃ کی طرف بنی عبد بن ثعلبہ میں لشکرِ اسلام کا شعار نعرۂ تکبیر تھا۔ علامہ سیّد محمد الواقدی فرماتے ہیں کہ اس لشکر کے سپہ سالار نے اپنی فوج کو کہا:

''اذا کبرت فکبروا فکبروا وکبروا جمیعاً معہ'' [۱۸]

جب میں نعرۂ تکبیر بلند کروں تم بھی نعرۂ تکبیر بلند کرو۔ چنانچہ سپہ سالار نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ مجاہدین نے بھی اس کے ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ شعبان ۷ھ میں حضرت سیدنا ابو بکر صدیق کی سرکردگی میں ایک لشکر نجد کی طرف روانہ ہوا۔ اس لشکر کا شعار ''اَمِتْ اَمِتْ'' تھا۔ امام واقدی نے لکھا: ''وکان شعار ناامت امت'' [۱۹] صفر ۸ھ میں سریہ کرید میں لشکرِ اسلامی کا شعار بھی یہی تھا۔ واقدی امام مغازی نے لکھا: ''وشعار ناامت امت'' [۲۰] اس روز ہمارا (لشکرِ اسلام) کا نعرہ اَمِتْ اَمِتْ تھا۔

غزوۂ خیبر میں صحابہ کرام کا شعار یا منصور امت تھا۔ امام مغازی واقدی نے لکھا: ''فکان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یغدو بالمسلمین علی را یاتھم وکان شعارھم یا منصور امت'' [۲۱] حضور اکرم ﷺ لشکرِ اسلام کے ساتھ نکلے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے اس روز ان کا نعرہ تھا: یا منصور اَمِتْ (اے منصور، انہیں ہلاک فرما) ''یقولون یالبیك یالبیك'' [۲۲] صحابہ کرام کا نعرہ تھا ''یالبیک یالبیک'' اربابِ علم و دانش جانتے ہیں کہ غزوۂ حنین میں ایک ایسا موقعہ آیا تھا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم عین معرکہ میں منتشر ہوگئے تھے۔ ان کے قدم اُکھڑنے لگے تھے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی برکت سے ان کے قدموں میں ثبات آگیا اور وہ دوبارہ جمع ہو کر عرض کرنے لگے یا رسول اللہ ﷺ ہم حاضر ہیں۔ یہی ان کا نعرہ تھا۔ ''یالبیک یالبیک''۔

حضورِ اکرم نُور مجسم ﷺ کے وصال کے بعد امیر المومنین سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دور میں مسیلمہ کذاب نے دعوائے نبوت کیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ حضور کے بعد میں نبی ہوں۔ بظاہر توحید پر ایمان کا مدعی تھا۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف جہاد فرمایا۔ اس جہاد میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا نعرہ اقتضائے حال کی تبدیلی سے بدل گیا تھا۔ مسیلمہ کذاب اور اس کے ہمنوا بظاہر توحیدِ باری تعالیٰ کے مقر تھے لیکن واضح اختلاف تو حضور انور ﷺ کی ختمِ نبوت کے عقیدے میں ہو گیا تھا اس لیے اس وقت صحابہ کرام کا نعرہ ''یارسول اللہ مدد'' تھا۔

مولانا سید احمد بن زینی دحلان المکی (م ۱۳۰۴ھ) قدس سرہ فرماتے ہیں۔ ''وصح ایضاً ان اصحاب النبی ﷺ لاقاتلوا مسیلمة الکذاب کان شعارھم وامحمداہ وامحمداہ۔'' [۲۳] صحیح روایات سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے مسیلمہ کذاب سے مقابلہ کیا تو ان کا نعرہ ''وامحمداہ وامحمدہ'' تھا۔ یاد رہے کہ اہلِ عرب جب کسی کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں تو منادی کے ابتدا میں ''واو'' اور اس کے آخر میں ''اہ'' کا اضافہ کرتے ہیں اسے استغاثہ کہتے ہیں۔ استغاثہ سے مقصود منادی سے مدد چاہنا ہے۔ ''وامحمداہ وامحمداہ'' کا ترجمہ ہماری زبان میں ''یارسول اللہ المدد یارسول اللہ المدد'' کے ہیں۔ [۲۴] گویا کہ پکارنے والا مستغیث اپنے منادی کو اپنا کلام سنا رہا ہے اور وارفتگی میں اپنے احوال عرض کر رہا ہے۔ خلاصۂ کلام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عین حالتِ جنگ میں حضورِ اکرم نورِ مجسم ﷺ کو مدد کے لیے پکارتے رہے تھے ان کا ایمان تھا کہ ہمارا استغاثہ بار گاہِ رسالت میں پہنچ رہا ہے اور حضور ان کا استغاثہ سُن رہے ہیں۔

خیر القرون، دورِ صحابہ و تابعین میں عجم کا وسیع علاقہ فتح ہوا۔ بے شمار جنگوں میں مسلمانوں کو کفار کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ظاہر ہے ان جنگوں میں مسلمانوں کا شعار اقتضائے حال کے پیشِ نظر بدلتا رہا۔ امام مغازی علامہ واقدی کے حوالے سے چند معرکوں میں مسلمانوں کے شعار کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جنگِ یرموک میں اسلامی فوج کے جتنے دستے تھے سب کا شعار مختلف تھا۔ علامہ واقدی نے اس کو یوں بیان کیا۔ ''وکان شعارھا (دوس) یومئذ الجنة الجنة قال الواقدی رحمہ اللہ تعالیٰ حدثنی موسیٰ بن محمد عن عطا بن مراد قال سالت رجالا عدة ماکان شعار المسلمین یوم الیرموك فاخبرت ان شعار ابی

عبیدة امت امت و شعار عبس یا لعبس وشعار الیمن من اخلاط الناس یا انصار اللہ وشعار خالد ومن مہ یاحزب اللہ وشعار حمیر الفتح الفتح وشعار درم والسکاسك الصبر الصبر وشعار بنی مراد یا نصر اللہ انزل فھذہ کانت شعار المسلمین یوم الیر موك" [25] جنگ یر موک میں: دوس قبیلے کا شعار اَلْجَنَّةُ اَلْجَنَّة، قبیلہ ابو عبیدہ کا شعار اَمِتْ اَمِتْ، قبیلہ عبس کا شعار یَا لَعَبْس، یمنی لوگوں کا شعار یَا اَنْصَا رَ اللہ، خالد اور اس کے سَاتھیوں کا شعار یَا حِزْبَ اللہ، حمیر کا شعار اَلْفَتْحُ اَلْفَتْحُ، درم اور سکاسک کا شعار اَلصَّبرُ اَلصَّبرُ، بنی مراد کا شعار یَا نَصْرَ اللہ اَنْزِلْ تھا۔ ضرار بن الازر اور ان کی اسیری کو ختم کرنے کی مہم میں خالد بن ولید کے ماہان پر حملے کے وقت اسلامی شعار کو واقدی نے یوں بیان کیا: "قال عبدالرحمن بن الحمیدی الجمعی وکان خالد امامنافی حملته ونحن من ورائه وکان شعارنا یا محمد یا منصور امتك امتك"[26] عبدالرحمٰن بن حمیدی جمعی فرماتے ہیں کہ اس روز ہمارے لشکر کے سپہ سَالار خالد بن ولید تھے ہم ان کے پیچھے کھڑے تھے اس روز ہمارا شعار "یَا مُحَمَّدُ یَا مَنْصُوْر اُمَّتْكَ اُمَّتْكَ" تھا۔ حَلب اور اس کے قلعوں کی فتح کے ضمن میں واقدی شعار کا تذکرہ یوں کرتے ہیں: "وکعب بن حمزة قلق علی المسلمین فجاھد عنھم وھو یجول بالرایة وینادی یا محمد یا محمد یانصر اللہ انزل معاشر المسلمین اتبعوا انماھی ساعة ویاتی النصر وانتم الا علون"۔[27] حلب کی فتح کے روز کعب بن حمزہ بڑے مضطرب تھے۔ ہاتھ میں جھنڈا پکڑے مسلمانوں کی جانب سے لڑرہے تھے اور پکار رہے تھے۔ "یا محمد یا محمد یا نصر اللہ انزل۔ اے جماعتِ مسلمین میرے ساتھ آؤ لڑائی کی گھڑی یہی ہے۔ انشاء اللہ مدد آنے والی ہے تم ہی سر فراز رہوگے۔" البہنسا کی فتح اور اس میں صحابہ کرام کے داخلے کے ذِکر میں واقدی نے مسلمانوں کا شعاریوں ذکر کیا: "وکان شعار المسلمین تلك اللیلة ینادون یا محمد یا محمد یا نصر اللہ انزل"۔[28] البہنسا کی فتح کی رات مسلمان جس شعار کو پکار رہے تھے وہ یہ تھا: "یا محمد یا محمد یا نصر اللہ انزل۔" البہنسا کی فتح میں صحابہ کرام کا ایک شعار ملاحظہ ہو: "وکان شعار المسلمین یا نصر اللہ انزل" [29] مسلمانوں کا شعار تھا "یا نصر اللہ انزل۔" اسی فتح کے روز حضرت خالد بن ولید کا شعار یوں تھا: "فصاح (خالد) وغوثاہ وامحمد اہ واسلاماہ"[30] حضرت خالد کا نعرہ تھا: "اے میرے مدد گار! یا رسول اللہ المدد اے اسلام مدد۔"

"مرج القبائل داخل الدروب" کے ذِکر میں واقدی نے اسلامی دستوں کا شعار ذکر کرتے ہوئے ضمنی طور پر ایک عجیب حکایت نقل کی۔ لکھتے ہیں: "السودان یا محمد یا محمد--- وسمعت قائلا یقول لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ فقلت ھذہ اصوات الملئکة فاتبعت الصوت فاذا ھوصوت دامس--- ومعه العشرة المأسورون وھم یقاتلون معه یسرة واساًلی صدرہ و قبله بین عینیه وقال له کیف کان امرکم قال اعلم ایھا الا میران الروم کانواقد تکاثروا علی فرسی فقاتلوہ روقعت فاخذونی اسیرا وجعلونی فی الحدید و فعلواباصحابی مثلی قد ایسنا من انفسنا فلما جن اللیل رایت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وھو یقول لاباس علیك یادامس اعلم ان منزلی عند اللہ عظمة ثم انه امریدہ الکریمة علی الحدید فسقط عنی وفعل ذلك مع اصحابی وقال لناالبشروا بنصراللہ فانا نبیکم محمد رسول اللہ وقال لی اقرئی عنی میسرة الا سلام وقل له جزاك اللہ خیر اثم غاب عنی فانتبھت--- وخرجنامن بینھم سالمین وھذا حد ثینا قال فضج المسلمو ن بالتھلیل والتکبیروالصلاة علی البشیرالنذیر۔" [31]

اس جنگ میں عرب کا شعار "اَلنَّصرُ النَّصرُ" اور سودان کا شعار "یا مُحَمَّدُ اہ یا مُحَمَّدُ اہ" تھا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے ایک آواز سُنی کہنے والا کہہ رہا تھا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسُول اللہ میں سمجھا کہ یہ فرشتوں کی آواز ہے۔ جب میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ دامس کی آواز ہے۔ وہ قید ہوچکا تھا اور اس کے ساتھ مزید دس مجاہد بھی قید ہوچکے تھے--- راوی میسرہ کہتا ہے کہ میں نے دامس کو سینے سے لگا لیا اور اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے۔ اس نے کہا: اے امیر حُسن، رومیوں نے میرے گھوڑے کا محاصرہ کرلیا۔ اسے قتل کردیا۔ میں نیچے گر پڑا۔ اُنھوں نے مجھے گرفتار کرلیا اور لوہے کی بیڑیاں پہنادیں۔ میرے ساتھیوں کے ساتھ بھی اُنھوں نے یہی کچھ کیا۔ اس حال میں ہم اپنے انجام سے مایوس ہوچکے تھے۔ جب رات ہوئی میں نے نبی رحمت رسول اکرم ﷺ کی زیارت کی۔ آپ نے فرمایا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ

تعالیٰ کے ہاں میرا بڑا مقام ہے۔ پھر آپ نے اپنا دستِ مبارک میری بیڑیوں پر پھیرا وہ فوراً کُھل گئیں۔ ایسے ہی آپ نے میرے دوسرے قیدی ساتھیوں کے ساتھ کرم فرمایا۔ آپ نے فرمایا۔ تمہیں بشارت ہو اللہ کی نصرت کی۔ میں تمہارا کریم رسول محمد ہوں (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ میری طرف سے میسرہ کو سلام کہنا اور اسے کہنا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بہترین جزا عطا فرمائے۔ اس کے بعد میں بیدار ہوا۔۔۔ (اس خواب کی کیفیت ہم نے بیداری میں مشاہدہ کی) ہم دشمنوں کے درمیان سے صحیح و سالم نکل آئے۔ یہ ہمارا حال ہے۔ مسلمانوں نے یہ دیکھ کر نعرہ ہائے رسالت بلند کیے۔

جنگِ یرموک کا شعار وہی تھا جو غزوۂ بدر اور اُحد کا تھا یعنی یَانَصۡرَ اللّٰہِ اَنۡزِلۡ یَا مَنۡصُوۡرُ اَمِتۡ اَمِتۡ (اے منصور! ہلاک فرما ہلاک فرما! اس سلسلۂ واقد کی روایت ملاحظہ ہو: "وکان شعارھم یا نصر اللہ انزل یا منصور امت امت وکان ھذا شعارھم یوم بدر واحد۔۔۔وصاح ابو عبیدۃ لسعید بن زید فحمل بمن معہ وھو ینادی لا الہ الا اللہ یا منصور امت امت"[۳۲] یاد رہے منصور اور نصر اللہ حضورِ اقدس نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے صفاتی اسما ہیں۔[۳۳] جنگوں میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کلمۂ طیبہ پڑھتے اور دافع البلا، غم خوار آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ندا فرماتے اور عرض کرتے۔ یارسول اللہ! دشمن کو ہلاک فرمایئے۔ سبحان اللہ کیسا پیارا عمل اور کتنا حسین عقیدہ تھا۔ اس اسلامی شعار سے صحابہ کرام کافروں سے ممتاز ہوتے تھے۔

اسلام کی آواز جب عرب سے نکل کر عجم میں پہنچی تو حالات میں تبدیلی آئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق اسلام سے علیحدہ ہو کر لوگ فرقوں میں تقسیم ہونے لگے۔ اگرچہ ہر فرقہ اپنے آپ کو اسلام کا وارث اور پیروکار گردانتا تھا مگر حقانیت کا معیار تو خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرما دیا تھا۔ "ما انا وعلیہ اصحابی۔" "میرا طریقہ مرضیہ اور صحابہ کرام کا عمل مبارک" یہ معیار ہر دور میں حق و باطل میں فاصل رہا اور آج بھی یہی معیار حق ہے وضو کے فرائض میں سے پاؤں کا دھونا یا موزوں پر مسح کرنا ہے۔ موزوں کا مسح کرنا صرف مباح ہے واجب نہیں اور نہ ہی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنا اور صحابہ کا شعار بنایا۔ مگر چونکہ رافضی اور خارجی موزوں کے مسح کو جائز اور مباح نہیں سمجھتے اور صحابہ کرام اور اہل بیت سے صحیح عقیدت نہیں رکھتے۔ اس لیے اس علاقے یا زمانے میں صحابہ کرام سے محبت اور موزوں پر مسح کرنا شعارِ اسلامی بنا۔ البحر الرائق شرح کنزالدقائق میں ہے: "روی ان ابا حنیفۃ سئل عن مذھب اھل السنۃ والجماعۃ فقال ھو ان تفضل الشیخین وتحب الختنین وتری المسح علی الخفین۔"[۳۴] امام الائمہ سراج الامہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا کہ اہلِ سنّت و جماعت کون لوگ ہیں۔ فرمایا اہلِ سنّت و جماعت وہ لوگ ہیں جو شیخین (سیدنا صدیق اکبر اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہما) کو دوسرے صحابہ سے افضل جانیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں داماد (سیدنا عثمان ذی النورین اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما) سے محبت کریں اور موزوں پر مسح کو جائز جانیں۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حالات، زمانے اور مقام کے بدلنے سے اسلامی شعار میں تبدیلی آگئی۔ جہاں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے لوگ عقیدت نہ کریں وہاں اسلامی شعار حبِ صحابہ ہے جہاں اسلامی مباح موزوں پر مسح کو مباح نہ سمجھا جائے وہاں موزوں پر مسح کرنا اہلِ سنّت و جماعت کا شعار ہے۔

کلمہ "علیہ الصلاۃ والسلام" انبیائے کرام اور ملائکہ مقربین کے ساتھ استعمال ہوتا ہے "رضی اللہ عنہ" صحابہ اور سلف صالحین کے ناموں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ "صلاۃ و سلام" اصالتاً کسی غیر نبی کے نام کے ساتھ استعمال کرنا اہلِ سنّت و جماعت کے نزدیک جائز نہیں۔ ہاں تبعاً اس کا استعمال ہوتا ہے۔ "صلاۃ و سلام" اصالتاً کسی غیر نبی کے نام کے ساتھ استعمال جائز ہے مگر اہلِ بدعۃ شیعہ وغیرہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و کرم اللہ وجہہ الکریم اور دیگر ائمہ اہلِ سنّت کے ناموں کے ساتھ "علیہ السلام" استعمال کرتے ہیں۔ ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں: "ان قول علی علیہ السلام من شعار اھل البدعۃ" "علی علیہ اسلام" کہنا اہل بدعت کا شعار ہے۔

مسلمانوں کو کسی خاص نوعیت کے لباس کا حکم نہیں۔ نہ ہی کسی لباس سے روکا گیا۔ ماسوائے لباس شہرت کے۔ البتہ اگر کوئی خاص نوعیت کا لباس کسی خاص قوم کا شعار بن جائے تو مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا گیا ہے مثلاً ہندوؤں کا زنار، مجوسیوں کی ٹوپی، نصاریٰ کا نشان صلیب وغیرہ۔ اس سلسلے میں علمائے کرام کا فیصلہ ملاحظہ ہو: "وفی الفتاوی الصغری من تقلنس بقلنسوۃ المجوس ای لبسھا

وتشبہ بھم فیھا او خاط خرقۃ صفراء علی العاتق ای وھو من شعار ھم او شد فی الواسط خیطا کفر اذا کان متشا بھا بخیطح او ربطھم او سماہ زنارا۔۔" [۳۵] "فتاویٰ صغریٰ" میں ہے کہ جس نے مجوسیوں کی سی ٹوپی پہنی جس سے مجوسیوں سے مشابہت ہوتی ہو یا کندھے پر زرد رنگ کا ٹکڑا سی لیا ہو جس سے مجوسیوں سے مشابہت ہو کہ یہ ان کا شعار ہے یا کمر میں دھاگہ باندھ لیا ہو جو ہنود کے زنار کے مشابہ ہو یا اس نے دھاگہ باندھ کر اس کا نام زنّار رکھا لیا ہو۔ ایسا کرنے والا کافر ہے۔ استغفراللہ ومن تزنر بزنار الیھود اوالنصاری وان لم ید خل کنیستھم کفر [۳۶] جس نے یہود یا نصاریٰ کی مشابہت میں زنار باندھا وہ شخص کافر ہوگیا اگرچہ ان کی عبادت گر جا میں نہ کیا گیا ہو۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کسی قوم کے شعار کی محض نقل اختیار کرنے سے آدمی اسی قوم میں شمار ہوتا ہے۔ اگر اسلام کا شعار اختیار کرے تو مسلمان اور اگر ہنود، یہود، نصاریٰ یا مجوس کا شعار اختیار کرے اگرچہ وہ ہندو، یہودی، نصاریٰ یا مجوسی نہ بنے اور نہ ان کا عقیدہ اختیار کرے اور نہ ان کی سی عبادت کرے نہ ان کی عبادت گاہ میں جائے مگر مشابہت کی بنا پر وہ شخص اس قوم کے حکم میں شامل ہوگیا۔

حضورِ اکرم ﷺ کے اس ارشاد کا مفہوم یہی ہے۔ "من تشبہ بقوم فھو منھم" [۳۷] جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کر لیتا ہے وہ انہی میں سے ہے۔ علامہ عبد الرؤف مناوی علیہ رحمۃ الباری نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا:

"معار لبسیرتھم وتخلق بخلقھم ومن تشبہ بالفساق یھان" [۳۸] جس نے کسی قوم کے سے اطوار اپنا لیے اور ان کے اخلاق سے متخلق ہوگیا اس مشابہت سے وہ شخص اس قوم میں شمار ہونے لگا جس نے فاسقوں کی مشابہت اختیار کر لی اسے ذلیل کیا جائے۔ مُلّا علی قاری علیہ رحمۃ الباری نے شعار کی اہمیت کو نہایت جامع الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے۔ "فالمدار علی الشعار" [۳۹] مدارِ کار شعار ہے۔ شعار سے قوموں کی پہچان ہے۔ شعار ہی وجہِ امتیاز ہے، شعار ہی دلیل ایمان ہے، شعار ہی دلیل کفر ہے۔

کوئی مخصوص درود شریف پڑھنا ضروری ہے نہ کسی درود شریف پڑھنے پر پابندی ہے۔ اپنے ذوق یا تعلیم کی بنا پر جو جس درود شریف کو اختیار کرلے جائز ہے۔ اسی طرح کسی خاص وقت درود شریف پڑھنے سے منع کرنا جائز نہیں۔ مباح اوقات میں جب چاہے اور جو درود شریف چاہے پڑھ سکتا ہے اس کو منع کرنے والا ناحق ہے۔ ہمارے اسلاف نے درود شریف کے مانعین کے سامنے صلوٰۃ و سلام پڑھ کر شعارِ اسلام کی حفاظت کی حتی کہ بعض اوقات اس شعار کی حفاظت میں مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ علامہ سید احمد بن زینی دحلان المکی سابق خطیب و مدرس مسجد حرام (م ۱۳۰۴ھ) نے اس نوعیت کا ایک واقعہ لکھا:

"ومن ذلك انه كان يكره الصلاة على النبی ﷺ ويتأذى بسماعها وينهى عن الاتيان بها ليلة الجمعة وعن الجهر بها على المنائر ويؤذى من يفعل ذلك ويعاقبه اشد العقاب حتى انه قتل راجلا اعمى كان موذنا صالحا ذا صوت حسن نهاه عن الصلاة على النبی ﷺ فامر بقتل فقتل" [۴۰] (محمد بن عبد الوہاب بن سلیمان نجدی) درود شریف پڑھنے کو مکروہ جانتا تھا۔ صلوٰۃ و سلام سننے سے ایذا محسوس کرتا تھا۔ جمعرات کو اور میناروں پر چڑھ کر بلند آواز سے صلوٰۃ و سلام پڑھنے سے منع کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ایسا کرتا تو اسے سخت ایذا دیتا اور سخت عذاب میں مبتلا کر دیتا۔ بیان کیا گیا کہ ایک موذن صالح خوش الحان ظاہری آنکھوں سے معذور تھا۔ اذان کے بعد وہ بلند آواز سے صلوٰۃ و سلام پڑھا کرتا تھا۔ نجدی نے اسے روکا۔ موذن صلوٰۃ و سلام پڑھنے سے نہ رُکا۔ نجدی نے حکم دیا کہ اس اذان کے بعد صلوٰۃ و سلام پڑھنے والے صالح موذن کا قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کے حکم سے اسے شہید کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ سابق خطیب و مدرس مسجد حرام علامہ سید احمد بن زینی و دحلان قدس سرہ کی تصریح سے معلوم ہوا کہ حرمین شریفین میں نجدی تغلب سے پہلے اذان کے بعد بلند آواز سے درود شریف پڑھا جانا اہلِ حرمین شریفین کا معمول تھا۔ نیز یہ کہ صالحین اسلامی شعار کی حفاظت اپنی جان کی حفاظت سے بڑھ کر کرتے تھے۔

آج جب کہ اہلِ سنّت و جماعت کہلانے والے عمل بالحدیث اور حبِ صحابہ کے مدعی ہیں۔ حدیث شریف اور صحابہ کے مقدس ناموں پر تنظیموں کے سرگرم رکن ہیں۔ مگر یہ حضرات حبِ نبی ﷺ اور تعاملِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قطعاً عاری ہیں۔ ایسے میں اہلِ سنّت و جماعت کا شعار یَا رَسُوْلَ اللہ ہے۔ درود شریف کی کثرتِ شعارِ

ایمان ہے۔ سبھی درود شریف پڑھنا جائز ہیں مگر شعارِ اسلام اَلصَّلٰوۃُ والسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ہے۔ مولا کریم اہلِ ایمان کی سیرت، تمدن، اخلاق اور شعار پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ بجاہ نبیہ الکریم علیہ التحیۃ والتسلیم وعلی الہ و صبحہ واتباعہ اجمعین یارب العالمین۔

## حواشی

۱۔ المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر للرافعی ج ۱ ص ۱۵۱، مطبوعہ دارالکتب العربیۃ الکبری، مصر۔

۲۔ منجد (اُردو) ص ۶۴۱، مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی۔

۳۔ انفس الفکر فی قربان البقر، مشمولہ رسائل رضویہ، جلد دوم، ص ۲۱۶، بار اول، مطبوعہ مکتبہ حامدیہ، لاہور۔

۴۔ ایضاً، ص ۲۱۶۔

۵۔ ایضاً، ۲۱۶، ۲۱۷، بحوالہ در مختار، فتح القدیر، شرح ہدایہ۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۱۷

۷۔ انفس الفکر فی قربان البقر، مشمولہ رسائل رضویہ، جلد دوم، ص ۲۱۷، بار اول، مکتبہ حامدیہ، لاہور۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۱۸۔ مزید تفصیل کے لیے الفتاویٰ الحدیثیہ لابن حجر الہیتمی المکی، ص ۱۱۷، مطبوعہ ترکیہ۔

۹۔ "انفس الفکر" از امام احمد رضا، ص ۲۱۸۔

۱۰۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: انفس الفکر فی قربان البقر، ص ۴۱۸۔

۱۱۔ تفصیل کے لیے ماحظہ ہو انفس الفکر فی قربان البقر، ص ۲۱۸، مطبوعہ مکتبہ حامدیہ، لاہور۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ فتاویٰ مولوی عبد الحی لکھنوی بحوالہ انفس الفکر فی قربان البقر، ص ۲۲۶۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۲۶۔

۱۵۔ مجموعہ فتاویٰ مولوی عبد الحی لکھنوی طبع اول، ص ۱۴۸ تا ۱۵۵، بحوالہ انفس الفکر فی قربان البقر، ص ۲۲۷، مطبوعہ مکتبہ حامدیہ، لاہور۔

۱۶۔ فتاویٰ مظہری جلد اوّل و دوم، بار اوّل مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کراچی، ص ۳۲۱، ۳۴۲۔

۱۷۔ بخاری شریف، جلد دوم، ص ۵۷۹، مطبوعہ لاہور۔

۱۸۔ المغازی للواقدی، جلد دوم ص ۷۲۷، مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن ۱۴۰۵ھ، نشر دانش اسلامی۔

۱۹۔ الغازی للواقدی، جلد دوم، ص ۷۲۲۔

۲۰۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۷۵۲۔

۲۱۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۷۴۴۔

۲۲۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۸۹۸، ۸۹۹۔

۲۳۔ خلاصۃ الکلام فی بیان امر اء البلد الحرام، سید احمد بن دحلان، الجز الثانی ص ۲۵۸، مطبوعہ مکتبہ اشیق استانبول ترکیہ ۱۳۹۴ھ، ۱۹۷۴ء۔

۲۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (الف) الکافیہ لابن حاجب (ب) شرح ملاجامی مطبوعہ نولکشور، ص ۸۹۔

۲۵۔ فتوح الشام للواقدی، جلد اوّل، ص ۱۳۱،
(الف) مطبوعہ مکتبہ التجاریۃ الکبری مصر،
(ب) مطبوعہ عبد الحمید احمد حنفی مصر، ص ۱۳۱۔

۲۶۔ ایضاً، جلد اول، ص ۱۲۸۔

۲۷۔ فتوح الشام للواقدی، جلد اول، ۱۵۷، مطبوعہ مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ مصر۔

۲۸۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۱۷۷۔

۲۹۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۱۵۵۔

۳۰۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۱۸۴۔

۳۱۔ فتوح الشام، للواقدی، جلد دوم، ص ۵، مطبوعہ مکتبہ التجاریۃ الکبری، مصر۔

۳۲۔ فتوح الشام للواقدی، جلد اوّل، ص ۱۳۳، مطبوعہ مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ مصر۔

۳۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (الف) دلائل الخیرات فصل اسماء النبی ﷺ، ص ۱۵۔ (ب) شرح زرقانی علی المواہب اللدنیہ، جلد ثالث، ص ۱۴۲، ومابعد مطبوعہ بیروت۔

۳۴۔ البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد اوّل، ص ۱۲۶۵، مطبوعہ ایچ، ایم سعید کمپنی، کراچی۔

۳۵۔ شرح فقہ اکبر، ملا علی قاری علیہ الرحمۃ، ص ۲۷۷، مطبوعہ مجتبائی دہلی۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۷۷۔

۳۷۔ (الف) ابو داؤد عن ابن عمر (ب) طبرانی فی الاوسط عن حذیفہ (ج) ابن رسلان بحوالہ جامع صغیر، جلد ثانی، ص ۲۸۹، مطبوعہ مصر۔

۳۸۔ مختصر شرح جامع صغیر لعلامہ مصطفیٰ محمد عمارہ، جلد ثانی، ص ۲۸۹، مطبوعہ مصر۔

۳۹۔ شرح فقہ اکبر، ص ۲۲۸، مطبوعہ مجتبائی دہلی۔

۴۰۔ خلاصۃ الکلام فی بیان امر البلد الحرام، الجزاء الثانی، ص ۲۳۰، مطبوعہ مکتبہ اشیق استنبول ترکیہ، (۱۳۹۴ھ۔ ۱۹۷۴ء)

✦✦✦✦✦

# جلی النص فی اماکن الرخص (۱۳۳۷ھ)

امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ الذی بعث نبینا صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم بشریعۃ سمحۃ سھلۃ غراء بیضاء لیلھا کنھارھا وافضل الصلوٰۃ واکمل السلام علی من احل لنا الطیبات وحرم علینا الخبائث ووضع عنا ما کان علی الامم الخالیۃ من الاصرو الاغلال واوزارھا وعلی اٰلہ وصحبہ واولیاءہ وحزبہ الذین جعلھم ربھم امۃ وسطا فقالوا بالحق وقاموابالعدل وفازو ابفیوض الشریعۃ وانوارھا وعلینا بھم و لھم وفیھم یاارحم الراحمین ابدالابدین فی کل اٰن وحین عدد اوبار الھدایا واصواف الضحایا واشعارھا اٰمین! (اللہ تعالٰی کے مقدس نام سے شروع جو بے حد رحم کرنے والا مہربان ہر قسم کی تعریف اس اللہ تعالٰی کے لیے ہے کہ جس نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی شریعت دے کر بھیجا جو کشادہ، نرم، آسان اور بے حد روشن ہے جس کی رات دن کی طرح ہے۔ اور عمدہ درود اور سب سے زیادہ کامل سلام ان پر نازل ہو کہ جنھوں نے ہمارے لیے پاک اور ستھری چیزیں حلال فرمادیں، اور گندی چیزی ہم پر حرام کردیں، اور جو بوجھ طوق اور گناہ گزشتہ امتوں کے ذمے تھے وہ ہم سے اتار دیے، اور ان کی اولاد، صحابہ، دوست اور ان کے گروہ پر بھی (درودو سلام ہو) جن کو ان کے پروردگار نے درمیانی امت بنایا، پھر انھوں نے حق بیان فرمایا اور انصاف قائم کیا، اور شریعت کے فیوضات و انوار کی وجہ سے کامیاب ہوئے، پھر ان کی وجہ سے ہم پر اور ان کے لیے اور ان کے اندر، اے سب سے بڑے رحم کرنے والے! ہر لمحہ اور ہمیشہ ہمیشہ رہے، قربانی کے اونٹوں کے بال اور مینڈھوں کی اون اور بکریوں کے بالوں کی تعداد کے مطابق رہے، یا اللہ! ہماری اس دعا کو شرف قبولیت سے نواز دے۔ ت)

امّابعد، یہ چند سطور کاشفۃ الستور بعون الغفور لامعۃ النور (چند سطریں پردہ اٹھانے والی، گناہ بخشنے والے روشن نور کی مدد سے۔ ت) اس بیان میں ہیں کہ بعض اوقات بعض ممنوعات میں رخصت ملتی ہے۔ اس کی اجمالی تفصیل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ ہر ممنوع کسی نہ کسی وقت مباح ہو سکتا ہے نہ ہر وقت ایسا کہ کسی نہ کسی ممنوع میں رخصت کی قابلیت رکھتا ہے۔ ادھر اس کے متعلق بعض قواعدِ فقہیہ میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

ایک اصل یہ ہے کہ درء المفاسد اھم من جلب المصالح[1] مفسدہ کا دفع مصلحت کی تحصیل سے زیادہ اہم ہے۔ حدیث ذکر کی جاتی ہے: ترك ذرۃ ممانھی اللہ عنہ افضل من عبادۃ الثقلین[2]۔ ایک ذرہ ممنوعِ شرعی کا چھوڑنا جن وانس کی عبادت سے افضل ہے۔ یہ قاعدہ مطلقالحاظِ نہی بتاتا ہے۔

دوم الضرورات تبیح المحظورات[3] مجبوریاں ممنوع کو مباح کر دیتی ہیں۔ اقول: (میں کہتاہوں۔ ت) اس کا استنباط کریمہ فاتقوا اللہ ما استطعتم[4] و کریمہ لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا[5] میں ہے یعنی مقدور بھر پرہیز گاری کرو اللہ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں رکھتا، یہ مطلقاًلحاظ ضرورت فرماتا ہے۔

سوم من ابتلی ببلیتین اختار اھونھما[6] دوبلاؤں کا مبتلا ان میں ہلکی کو اختیار کرے۔ اقول: یہ کریمہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان[7] (مگر وہ شخص کہ جس پر زبردستی کی جائے جبکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو۔ ت) سے ماخوذ ہے یہ قاعدہ دونوں اطلاق نہیں کرتا بلکہ موازنہ چاہتا ہے۔

چہارم الضرر یزال[8] (نقصان کو دور کیا جاتا ہے۔ ت) ضرر مدفوع ہے۔ قال عزوجل (اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا۔ ت) ماجعل علیکم فی الدین من حرج[9] تم پر دین میں کوئی تنگی نہ رکھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لاضرر ولا ضرار (نہ ضرر لو نہ ضرر دو) رواہ ابن ماجۃ[10] عن عبادۃ واحمد عن ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنھم بسند حسن۔ (ابن ماجہ نے اس کو حضرت عبادہ سے روایت کیا اور امام احمد نے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہم سے سندِ حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ت) ارتکابِ ممنوع بھی ضرر ہے تو یہ اصل اول سے موافق ہے اور انسانی ضرورت بھی ضرر ہے تو اصل

دوم کے مطابق ہے۔

پنجم المشقة تجلب التیسیر[11] مشقت آسانی لاتی ہے۔اور اسی کے معنی میں ہے ماضاق امرالا اتسع [12] (کوئی معاملہ تنگ نہیں ہوا مگر اس میں کشادگی رکھی گئی۔ت) مولیٰ سبحانہ فرماتا ہے: یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر [13]۔ اللہ تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا۔اس کا دائرہ ضرورت و مجبوری سے وسیع تر ہے۔ ششم ماحرم اخذہ حرم اعطاؤہ [14] جس کا لینا حرام اس کا دینا بھی حرام۔قال تعالیٰ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ت) ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان [15]۔ گناہ اور حد سے بڑھنے پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

ہفتم انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی [16]۔ اعمال نیتوں پر ہیں اور ہر ایک کے لیے اس کی نیت۔

قال عزوجل: یایھا الذین اٰمنوا علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذا اھتدیتم [17]۔ ایمان والو! آپ ٹھیک رہو دوسرے کا بہکنا تمھیں ضرر نہ دے گا جب تم راہ پر ہو۔

ہم دیکھتے ہیں حج میں مدت سے ٹیکس لیے جاتے ہیں اور اس سے حج ممنوع نہیں ہو جاتا، تجارتوں پر صدہا سال سے تمام دنیا میں ٹیکس اور چنگیاں ہیں اس سے تجارت بند نہیں کی جاتی یہ قاعدہ ہفتم کے موافق ہے لیکن سود کا لینا دینا دونوں حرام، حدیثِ صحیح میں دونوں پر لعنت فرمائی، دوسری حدیث میں ارشاد ہوا: الراشی والمرتشی کلاھما فی النار [18]۔ رشوت دینے اور لینے والا دونوں جہنم میں ہیں۔

یہ قاعدہ ششم کے مطابق ہے لہٰذا بقدر وسعت ان مواقع واماکن کا بیان چاہیے جہاں رخصت ملتی ہے اور جہاں نہیں کہ ان قواعد کے موارد واضح ہوں نیز مسائل کثیرہ ومباحثِ غزیرہ باذنہ تعالیٰ روشن ولائح ہوں نیز اس شریعتِ مطہر کی رحمتیں اور اس کا اعتدال اور برخلاف شرائع یہود ونصاریٰ سختی ونرمی محض سے انفصال ظاہر ہوں وباللہ التوفیق (اللہ تعالیٰ ہی کے کرم سے توفیق حاصل ہوتی ہے۔ت) علماء فرماتے ہیں: مراتب پانچ ہیں:

(۱) ضرورت (۲) حاجت (۳) منفعت (۴) زینت (۵) فضول۔ امام محقق علی الاطلاق نے اسے اقسامِ اکل میں دکھایا اور ضرورت یہ بتائی کہ بے اس کے ہلاک یا قریب ہلاک ہو، اور حاجت یہ کہ حرج ومشقت میں پڑے، باقیوں کی تعریف نہ فرمائی مثال بتائی، منفعت گیہوں کی روٹی بکری کا گوشت، زینت حلوا، مٹھائی، فضول طعام شبہہ حرام، ونقلہ فی غمز العیون [19] من قاعدۃ الضرر یزال واقتصر علیہ (غمز العیون میں اسے اس قاعدے سے نقل فرمایا کہ نقصان دور کیا جائے۔اور اسی پر اکتفاء کیا۔ت)

فقیر بقدر فہم کلام عام کرے فاقول: (پس میں کہتا ہوں۔ت) پانچ چیزیں ہیں جن کے حفظ کو اقامت شرائع الٰہیہ ہے دین و عقل ونسب ونفس ومال عبث محض کے سوا تمام افعال انھیں میں دورہ کرتے ہیں اب اگر فعل (کہ ترک بمعنی کف کو کہ وہی مقدور وزیر تکلیف ہے نہ کہ بمعنی عدم کما فی الغمز وغیرہ بھی شامل) اگر ان میں کسی کا موقوف علیہ ہے کہ بے اس کے یہ فوت یا قریب فوت ہو تو یہ مرتبہ ضرورت ہے جیسے دین کے لیے تعلم ایمانیات و فرائض عین، عقل ونسب کے لیے ترک خمر وزنا، نفس کے لئے اکل وشرب بقدر قیام بنیہ، مال کے لیے کسب ودفع غصب امثال ذٰلک، اور اگر توقف نہیں مگر ترک میں لحوق مشقت وضرر وحرج ہے تو حاجت جیسے معیشت کے لیے چراغ کہ موقوف علیہ نہیں ابتدائے زمانۂ رسالت علی صاحبھا افضل الصلوٰۃ والتحیۃ (صاحب رسالت پر عمدہ درود اور ثناء ہو۔ت) میں ان مبارک مقدس کاشانوں میں چراغ نہ ہوتا، ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: والبیوت یومئذ لیس فیھا مصابیح، رواہ الشیخان [20]۔ (گھروں میں ان دنوں چراغ نہیں ہوتے تھے۔ بخاری ومسلم نے اسے روایت کیا۔ت) مگر عامہ کے لیے گھر میں بالکل روشنی نہ ہونا ضرر وباعث مشقت وحرج ہے، اور اگر یہ بھی نہ ہو مگر حصول مفید ہے نفس فائدہ مقصودہ اس سے حاصل ہوتا ہے، تو منفعت جیسے مکان کے ہر دالان میں ایک چراغ، اور اگر فائدہ مقصودہ کی تحصیل اس پر نہیں بلکہ ایک امر زائد زیب وزیبائش بقدر اعتدال کے لیے ہے تو زینت جیسے چراغ کی جگہ فانوس، اور اگر اس سے اتنا فائدہ بھی نہیں یا اس میں افراط اور خروج عن الحد ہے فضول جیسے بے کسی نیت محمودہ کے گھر میں چراغاں۔

اب مواضع ضرورت کا استثناء تو بدیہی جس کے لیے اصل دوم کافی اور اس کی فروع معروف ومشہور اور استفسار سے بعید ومہجور، مثلاً کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے بیٹھ کر پڑھے ورنہ لیٹ کر ورنہ اشارہ

سے الی غیر ذٰلك مما لایخفی (ان کے علاوہ باقی صورتیں جو کسی سے پوشیدہ نہیں۔ت) اس کے لیے تمام ممنوعات کہ کسی حال میں قابل اباحت یا متحمل رخصت ہوں یا مرخص ہوجاتے ہیں نہ مثل زنا و قتل ناحق مسلم کہ کسی شدید سے شدید ضرورت کے لیے بھی مرخص نہیں ہوسکتے، یہاں تک کہ اگر صحیح خوف قتل کے سبب بھی ان پر اقدام کرے گا مجرم ہوگا، حکم ہے کہ باز رہے اگرچہ قتل ہوجائے، اگر مارا گیا اجر پائے گا کما نصوا علیہ اصولا و فروعا (جیسا کہ اصول و فروع کے لحاظ سے ائمہ کرام نے اس کی تصریح فرمائی۔ت) پھر اپنی ضرورت تو ضرورت ہے ہی دوسرے مسلم کی ضرورت کا بھی لحاظ فرمایا گیا۔ مثلاً:

(۱) دریا کے کنارے نماز پڑھتا ہے اور کوئی شخص ڈوبنے لگا اور یہ بچا سکتا ہے لازم ہے کہ نیت توڑے اور اسے بچائے، حالانکہ ابطال عمل حرام تھا۔ قال تعالٰی لاتبطلوا اعمالکم[۲۱]۔ (اللہ تعالٰی نے ارشاد فرمایا: اے ایمان والو اپنے اعمال کو باطل نہ کیا کرو۔ت)

(۲) نماز کا وقت تنگ ہے ڈوبتے کو بچانے میں نکل جائے گا، بچائے، اور نماز قضاء پڑھے اگرچہ قصداً قضا کرنا حرام تھا۔

(۳) نماز کا وقت جاتا ہے اور قابلہ اگر نماز میں مشغول ہو بچے پر ضائع ہونے کا اندیشہ ہے نماز کی تاخیر کرے۔

(۴) نماز پڑھتا ہے اور اندھا کنویں کے قریب پہنچا، اگر یہ نہ بتائے وہ کنویں میں گر جائے نیت توڑ کر بتانا واجب ہے۔ اشباہ میں ہے: تخفیفات الشرع انواع الخامس تخفیف تاخیر کتاخیر الصلٰوۃ عن وقتھا فی حق مشتغل بانقاذ غریق و نحوہ[۲۲]۔ (شریعت کی سہولتوں کی کئی قسمیں ہیں، پانچویں قسم یہ ہے کہ تاخیر کی سہولت ہے۔ جیسے دو شخص جو کسی ڈوبتے ہوئے کو بچائیں تو اس کا اپنی نماز میں تاخیر کرنا۔ ت) ردالمحتار کتاب الحج میں ہے: جاز قطع الصلٰوۃ اوتاخیرھا لخوفہ علی نفسہ او مالہ او نفس غیرہ او مالہ کخوف القابلۃ علی الولد والخوف من تردی اعمی وخوف الراعی من الذئب وامثال ذٰلك[۲۳]۔ (نماز توڑ نا دینا یا اس میں تاخیر کرنا جائز ہے جبکہ کسی شخص کو اپنی جان یا اپنے مال کا خطرہ ہو، یا کسی دوسرے کی جان و مال کے تباہ ہونے کا اندیشہ ہو، جیسے دایہ کا بچے کی پیدائش کے وقت ڈر یا اندھے کے کنویں میں گرنے کا خوف، یا چرواہے کا بھیڑیے سے خطرہ، یا اس قسم کے دوسرے مواقع۔ت) اقول: (میں کہتا ہوں۔ت) یہ بھی حقیقۃً اپنے نفس کی طرف راجع کہ یہ شرعاً ان کے بچانے پر مامور ہے۔

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

(اگر میں یہ دیکھوں کہ اندھا اور کنواں ہے تو اگر اس موقع پر خاموش رہوں تو گناہ ہے۔ت) ولہٰذا جن کا نفقہ اس پر لازم ہے بے ان کا بندوبست کیے حج کو نہ جائے اور جن کا نفقہ اس پر نہیں اگرچہ اس کے چلے جانے سے ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اس پر لحاظ لازم نہیں کہ یہ یہاں رہتا جب بھی تو انھیں نفقہ دینے کا شرعاً مامور نہ تھا، محیط پھر عالمگیریہ میں ہے: کرھت خروجہ (ای للحج) زوجتہ واولادہ او من سواھم ممن تلزمہ نفقتہ وھو لایخاف الضیعۃ علیھم فلا باس بان یخرج و من لاتلزمہ نفقتہ لوکان حاضرا فلاباس بالخروج مع کراھتہ وان کان یخاف الضیعۃ علیھم[۲۴]۔ اگر اس کی بیوی اور بچے یا ان کے علاوہ دوسرے افرادِ کنبہ کہ جن کا خرچہ اس پر لازم ہے اگر یہ حج کے لیے جائے اور یہ سب اس کے جانے کو پسند نہ کریں اور اسے ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر اس صورت میں اس کے جانے میں کوئی حرج نہیں اور جن لوگوں کا خرچہ اس پر لازم نہیں، اگر یہ موجود ہو تو ناپسندیدگی کے باوجود اس کے باہر جانے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ اس کے ضائع ہونے کا خدشہ ہو۔ت)

اور زینت و فضول کے لیے کسی ممنوعِ شرعی کی اصلا رخصت نہ ہوسکنا بھی ایضاح سے غنی جس پر اصل اول بدرجہ اولٰی دلیل وافی ورنہ احکام معاذاللہ ہوائے نفس کا بازیچہ ہوجائیں، اقول: یوہیں مجرد منفعت کے لیے کہ وہ اصل مدلول اصل اول اور اس پر کتب معتمدہ میں فروع کثیرہ دال:

(۱) حقنہ بضرورت مرض جائز ہے اور منفعتِ ظاہرہ مثلاً قوتِ جماع کے لیے ناجائز ہے۔ ردالمحتار میں ذخیرہ امام اجل برہان الدین محمود سے ہے: یجوز الاحتقان للمرض فلواحتقن لا لضرورۃ بل لمنفعۃ ظاھرۃ بان یتقوی علی الجماع لایحل عندنا[۲۵] اھ (بیمار کے لیے حقنہ کرنے کی اجازت ہے اگر اس نے بغیر ضرورت حقنہ لیا کسی ظاہری فائدے کے لے مثلاً اس لیے کہ جماع پر قوی ہو تو ہمارے لیے یہ حلال نہیں اھ ت) اس پر حواشیِ فقیر میں ہے: اقول: ھذا

ظاهر اذا كان معه من القوة مايقدر به على اداء حق المرأة فى الديانة وتحصين فرجها اما اذاعجزعن ذٰلك فهل يعد ضرورة الظاهر لالانه بسبيل من ان يطلقها فتنكح من شاءت فان الواجب عليه احد امرين امساك بمعروف او تسريح باحسان فان عجزعن الاول لم يعجزعن الاخر نعم المعهود فى الهند ان النساء يتعيرن بالزواج الثانى تعيرا شديدا لكن هذا من قبلهن بجهلهن ليس عليه فيه اخذ فليتأمل [۲۶] انتهى ما كتبت عليه۔ (میں کہتاہوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ جب اس میں قوت مردمی موجود ہو کہ جس کی وجہ سے یہ عورت کا حق ادا کرنے پر قدرت رکھتا ہے دیانت اور حفاظت فروج کے لحاظ سے لیکن اگر یہ اس سے عاجز ہے تو کیا اس کو بھی ضرورت میں شمار کیا جائے گا؟ ظاہر یہ ہے کہ صورت ضرورت میں شمار نہیں، کیونکہ اس کے لیے یہ راستہ ہے کہ اس صورت میں یہ عورت کو طلاق دے دے تو پھر وہ جس سے چاہے نکاح کرلے، کیونکہ اس پر دوباتوں میں سے ایک واجب ہے۔ یا بھلائی کے ساتھ روک رکھنا یا احسان کرتے ہوئے چھوڑ دینا، اگر یہ پہلی بات سے عاجز ہو گیا تو دوسری سے عاجز نہیں، ہاں البتہ ہندوستان میں مشہور و متعارف یہ ہے کہ عورتیں دوسرا نکاح کرنے سے سخت عار محسوس کرتی ہیں، لیکن یہ پابندی عورتوں کی طرف سے عائد کردہ ہے ان کی ناسمجھی کی وجہ سے، اس میں اس پر کوئی گرفت نہیں، اس بات میں غور و فکر کرنا چاہیے، یہ آخر عبارت ہے جو میں نے اس کے حاشیے میں لکھی۔ت)

(۲) حلال کام میں تیس روپیہ مہینہ پاتاہے اور نصرانی ناقوس بجانے پر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار دیں گے اس منفعت کے لیے یہ نوکری جائز نہیں۔

(۳) یوہیں بھٹی کے لیے شیرہ نکالنے کی، فتاوٰی امام اجل قاضی خان میں ہے: رجل اجر نفسه من النصارى لضرب الناقوس كل يوم بخمسة دراهم ويعطى فى عمل اٰخر كل يوم درهم قال ابراهيم بن يوسف رحمه الله تعالٰى لاينبغى ان يؤاجر نفسه منهم انما عليه ان يطلب الرزق من موضع اٰخر وكذا لو اٰجر نفسه منهم بعصر العنب للخمر لان النبى صلى الله تعالٰى عليه وسلم لعن العاصر [۲۷] اھ۔ ایک آدمی عیسائیوں کے ہاں بگل بجانے کی نوکری اختیار کرتاہے کہ اسے ہر دن اس کام پر پانچ درہم ملیں گے لیکن اگر کوئی دوسرا جائز کام کرے تو اس پر یومیہ ایک درہم ملے گا امام ابراہیم بن یوسف رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے فرمایا کہ اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ عیسائیوں کے ہاں بگل بجانے کی نوکری کرے، بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی دوسری جگہ سے رزقِ حلال تلاش کرے، اور یہی حکم ہے اس شخص کا جو شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑنے کی ملازمت کرتاہے اس لیے کہ حضور ﷺ نے اس باب میں جن بدنصیبوں پر لعنت فرمائی ان میں انگور نچوڑنے والا بھی شامل ہے (عبارت مکمل ہوگئی)۔ت)

اقول: ولاينبغى ههنا بمعنى لايجوز بدليل قوله عليه فانه لايجاب وبدليل تشبيه فى الحاكم بماصح عليه اللعن۔ (میں کہتاہوں لاینبغی یہاں بمعنی لایجوز ہے۔ یعنی اس کے لیے یہ جائز ہی نہیں، اور اس کی دلیل مصنف کا یہ قول "علیہ" ہے کیونکہ لفظ علی ایجاب کے لیے آتاہے اور اس دلیل سے کہ مصنف نے اس مسئلے کو حکم میں اس سے تشبیہ دی کہ جس پر لعنت ہے۔ت)

(۴و ۵) موچی کو نیچری وغیرہ فاسقانہ وضع کا جوتا بنانے یا درزی کو ایسی وضع کے کپڑے سینے پر کتنی ہی اجرت ملے اجازت نہیں، کہ معصیت پر اعانت ہے۔ خانیہ میں متصل عبارت مذکورہ ہے: وكذا الاسكاف اوالخياط اذا استوجر على خياطة شيئ من زى الفساق ويعطى له فى ذٰلك كثيراجر لايستحب له ان يعمل لانه اعانة على المعصية [۲۸] اھ، اقول: ولايستحب ههنا للنهى لاجل التشبيه المذكور و بدليل الدليل ففى الخانية مسئلة الطبل لايجوز لانه اعانة على المعصية [۲۹] وفى اوائل شهادات الهندية عن المحيط الاعانة على المعاصى من جملة الكبائر [۳۰]۔ (اور یہی حکم ہے موچی اور درزی کا کہ جب اسے کسی ایسی چیز کے لینے اور بنانے پر اُجرت دی جائے جو فاسقوں کی وضع اور شکل کا لباس ہو، اور اس میں اسے زیادہ اجرت دینے کا وعدہ کیا جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ یہ کام کرے اس لیے کہ گناہ پر یہ دوسرے کی امداد کرناہے۔ اھ اقول (میں کہتاہوں کہ) یہاں "لایستحب" بمعنی نہی ہے تشبیہ مذکور کی وجہ سے، اور دلیل کی دلیل کی وجہ سے چنانچہ فتاوٰی قاضی خاں میں طبلہ بجانے کے متعلق ہے کہ جائز نہیں اس لیے کہ یہ گناہ پر امداد دینا ہے اور فتاوٰی عالمگیری کی بحث "اوائل شہادات" میں محیط سے نقل کیا کہ گناہ کے کاموں میں کسی کی امداد کرنا کبیرہ گناہوں میں شامل

ہے۔ت)

(۶) لکڑی جنگل سے مفت مل سکتی ہے اور ایک شخص لینے نہیں دیتا جب تک اسے رشوت نہ دو، دینا حرام، بحرالرائق میں ہے:وفی القنیة قبیل التحری الظلمة تمنع الناس من الاحتطاب من المروج الا بدفع شیئ الیهم فالدفع والاخذ حرام لانه رشوة[31]۔ قنیہ کی بحث تحری، سے تھوڑا پہلے یہ مسئلہ مذکور ہے کہ ظالم لوگ چراگاہ سے لوگوں کو لکڑیاں نہیں لانے دیتے جب تک کہ انھیں کچھ نہ دے، اور دینا اور لینا دونوں حرام ہیں اس لیے کہ یہ رشوت ہے۔ت)

(۷)کعبۂ معظمہ کی داخلی کس درجہ منفعت عظیمہ ہے مگر بے لیے دیے نہ کرنے دیں تو جائز نہیں کہ اس پر لینا حرام ہے تو دینا بھی حرام، اور حرام محض منفعت کے لیے حلال نہیں ہو سکتا، ردالمحتار میں ہے: فی شرح اللباب ویحرم اخذ الاجرة لمن یدخل البیت اویقصد زیارة مقام ابراهیم علیه الصلوٰة والسلام بلاخلاف بین علماء الاسلام وائمة الانام کما صرح به فی البحر وغیره اه وقد صرحوا بان ماحرم اخذه حرم دفعه الا لضرورة ولا ضرورة هنا لان دخول البیت لیس من مناسك الحج[32] اھ۔ (شرح لباب میں ہے اس شخص کو اجرت دینا حرام ہے جو کسی کو کعبہ شریف کے اندر لے جائے، یا وہ مقامِ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کرنے کا ارادہ کرے، اس مسئلہ میں تمام علما کا اتفاق ہے۔ علماءِ اسلام اور ائمۂ انام میں سے کسی کا اختلاف نہیں جیسا کہ "بحرالرائق" وغیرہ میں اس کی تصریح کی گئی اھ، اہلِ علم نے یہ تصریح فرمائی کہ جس چیز کا لینا حرام اس چیز کا دوسرے کو دینا بھی حرام ہے۔ مگر یہ کہ خاص مجبوری ہو، اور یہاں کوئی مجبوریِ نہیں، کیونکہ کعبہ شریف کے اندر داخل ہونا احکام حج میں سے نہیں اھ۔ت) اس پر حواشیِ فقیر میں ہے:ولاهو واجبا فی نفسه فمن الجهل ارتکابه لاتیان مستحب بل این الاستحباب مع لزوم الحرام وما عن الامام رضی الله تعالٰی عنه من بذله شطر ماله للسدنة لیبیت لیلة فی الکعبة الشریفة فختم فیها القراٰن الکریم فی رکعتین فاقول: یجب انه کان بعد التصریح بنفی الاجرة والصریح یفوق الدلالة کما نصوا علیه فی الخانیة وغیرها۔ اور یہ اس بناء پر بذاتہٖ واجب بھی نہیں تو پھر مستحب ادا کرنے کے لیے اجرت دینے کا ارتکاب جہالت ہے بلکہ لزومِ حرام کے ساتھ استحباب کیسے ہو سکتا ہے۔ اور جو کچھ امامِ اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنے مال کا کچھ حصہ خادمانِ کعبہ کے لیے خرچ کیا تاکہ خانۂ کعبہ میں رات گزاریں اور وہاں دو نفلوں میں پورا قرآنِ مجید ختم کریں، فاقول: (پس میں کہتاہوں) ضروری ہے کہ یہ کام نفی اجرت کی تصریح کے بعد ہو، اور صریح کلام دلالت سے فائق (اوپر) ہوتا ہے، جیسا کہ فتاوٰی قاضی خان وغیرہ میں ائمۂ کرام کی اس پر تصریح موجود ہے۔ت)

(۸) وقف اگر قابل انتفاع نہ رہے اسے بیچ کر اس کے عوض دوسری زمین خرید کر وقف کرسکتے ہیں لیکن اگر وہ قابل انتفاع ہے اور اس کی قیمت کو دوسری جگہ وہ زمین مل سکتی ہے کہ اس سے سوحصے زائد منفعت رکھتی ہو تبدیل جائز نہیں، فتح القدیر میں ہے:الاستبدال لاعن شرط ان کان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف علیهم به فینبغی ان لایختلف فیه وان کان لالذٰلك بل امکن ان یوخذ بثمن الوقف ماهو خیر منه فینبغی ان لایجوز لان الواجب ابقاء الوقف علی ماکان علیه دون زیادة اخری[33] (ملتقطا) (تبادلہ کرنا بغیر شرط جبکہ وقف "موقوف علیہ" کے لیے قابل انتفاع نہ ہو، مناسب ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہ کیا جائے، اور اگر یہ نہ ہو (یعنی وقف قابل انتفاع ہو) لیکن وقف کو فروخت کردیا جائے اور اس کے بدل اس سے اعلیٰ اور عمدہ زمین خرید لی جائے تو مناسب ہے کہ یہ صورت جائز نہ ہو، کیونکہ واجب یہ ہے کہ جس حالت پر پہلے وقف تھا اسی حالت پر اسے باقی رکھا جائے اور اس میں کوئی زیادت اور اضافہ نہ کیا جائے۔ت)

بالجملہ مسائل بکثرت ہیں کہ محض منفعت مبیح ممنوع نہیں ہوسکتی۔فانقلت الیس فی سیر الهندیة عن الذخیرة وفی کراهیتها عن المحیط مانصه وان اراد الخروج للتجارة الی ارض العدو بامان فکرها (ای الابوان) خروجه فان کان امرایخاف علیه منه وکانوا قوما یوفون بالعهد یعرفون بذٰلك وله فی ذٰلك منفعة فلا باس بان یعصیهما[34] اھ فقد ابیح عصیانهما للمنفعة اقول: یجب ان یراد به ما اذا کان نهیهما لمجرد محبة وکراهة فراقه غیر جازم ولذا فرضوا خروجه بامان وکونهم معروفین بالوفاء حتی لایخاف

علیه منه اما اذا خیف لم یحل له الخروج بغیر اذنهما لان نهیهما اذن یکون نهی جزم ففی الکتابین بعده وانکان یخرج فی تجارة ارض العدو مع عسکر من عساکر المسلمین فکره ذٰلك ابواه او احد هما فان کان ذٰلك العسکر عظیما لایخاف علیهم من العد وبالکبرالرائ فلا باس بان یخرج وان کان یخاف علی العسکر من العدو الغالب الرائ لایخرج بغیر اذنهما و کذٰلك ان کانت سریة اوجریدة الخیل لایخرج الاباذنهما لان الغالب هو الهلاك فی السرایا[۳۵] اھ فتسمیة عصیانا بحسب الصورة الا تری ان العبد بسبیل من خیرة نفسه فی نهی الشرع الارشادی الغیر الجازم فکیف بنهی الابوین کذٰلك لولم یرد ذٰلك فکیف یحل عصیانهما لمنفعة مالیة وهذا نبینا صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قائلا ولا تعقن والدیك وان امراك ان تخرج من اهلك ومالك رواه احمد[۳۶] بسند صحیح علی اصولنا والطبرانی فی الکبیر عن معاذ بن جبل رضی الله تعالیٰ عنه ولفظه فی اوسط الطبرانی اطع والدیك وان اخرجاك من مالك وعن کل شیئ هولك[۳۷] فافهم وتثبت بالتنبه فلیس الفقه الابالتفقه ولا تفقه الا بالتوفیق۔ (اگر کہا جائے کہ کیا فتاوٰی عالمگیری بحث سیر، بحوالہ ذخیرہ اور بحث کراہیۃ بحوالہ محیط میں یہ مذکور نہیں کہ جس کی اس نے تصریح فرمائی اگر تجارت کے لیے سرزمین دشمن کی طرف اجازت نامہ لے کر جانا چاہے لیکن والدین اس کے وہاں جانے کو ناپسند کریں، اگر معاملہ پرامن ہو، اس میں کوئی خطرہ اور اندیشہ نہ ہو، اور وہ وعدہ وفا کرتے ہوں اور اس وصف میں مشہور و معروف ہوں اور اس کا بھی وہاں جانے میں فائدہ ہو، تو پھر اس صورت میں والدین کا حکم نہ ماننے میں کوئی حرج نہیں اھ (یہاں دیکھیے کہ) حصول فائدہ کے لیے والدین کی نافرمانی کو جائز اور مباح قرار دیا گیا اقول: (میں کہتا ہوں) واجب ہے کہ اس سے وہ صورت مراد ہو کہ جس میں والدین کا اسے روکنا محض محبت اور شفقت کے طور پر ہو اور اس کی جدائی کا ناپسند ہونا غیر یقینی ہو، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے خروج کو امن اور وہاں کے لوگوں کا وفادار ہونے میں مشہور و معروف ہونے پر مسئلے کو فرض کیا یہاں تک کہ اسے اس معاملے میں کوئی خوف و خطرہ نہ ہو، لیکن اگر خطرہ و اندیشہ ہو تو پھر والدین کی اجازت بغیر اس کا باہر جانا اور سفر کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ دریں صورت ان کی نہی یقینی ہوگی، پھر ازیں بعد دو کتابوں میں مذکور ہے اگر کاروبار کے لیے دشمن کے ملک میں اسلامی فوجوں میں سے کسی اسلامی فوج کے ساتھ باہر جائے تو والدین یا ان میں سے کوئی ایک اس جانے کو ناپسند کریں، پس اگر یہ لشکرِ عظیم ہو کہ ان کی موجودگی میں غالب رائے کے مطابق دشمن سے کوئی خطرہ اور کھٹکا نہ ہو تو پھر اس صورت میں اس کے باہر جانے میں کچھ حرج نہیں لیکن اگر لشکرِ اسلام کو غالب رائے کے مطابق دشمن سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ وخطرہ ہو تو پھر والدین کی اجازت کے بغیر نہ جائے اور اسی طرح اگر فوجی دستہ یا گھڑ سواروں کا رسالہ ہو تو بغیر اجازت والدین باہر نہ جائے کیونکہ فوجی دستوں میں غالباً ہلاکت ہوا کرتی ہے اھ پھر اس کو "عصیان" کہنا بلحاظ صورت ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ شرعی غیر جازم نہیں اور شادی کے باوجود بندے کو اپنے نفس کا اختیا رہوتا ہے، پھر جب والدین کی نفی بھی ایسی ہے تو کیسے نہ ہوگا اگر یہ مراد نہ ہو تو پھر ان کا "عصیان" دنیاوی مالی فائدے کے لیے کیسے جائز ہوگا، یہ ہمارے حضورِ پاک ﷺ فرمارہے ہیں "اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو اگرچہ وہ تمھیں اہل وعیال اور مال سے الگ ہونے کا حکم دیں" امام احمد نے ہمارے اصولوں کے مطابق سندِ حسن کے ساتھ اس کو روایت فرمایا، اور امام طبرانی نے معجم الکبیر میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اس کو روایت فرمایا۔ اور اس کے الفاظ "اوسط طبرانی" میں یہ ہیں: "(اے شخص!) اپنے والدین کی اطاعت کیجیے اگرچہ تمھیں تمھارے مال اور تمھارے ہر مملوکہ شے سے تمھیں الگ اور بر طرف کردیں" اس کو خوب سمجھ لیجیے، اور ہوشیاری سے ثابت قدم رہیے، کیونکہ فقہ بغیر سمجھے نہیں ہو سکتی، اور سمجھ بوجھ حصولِ توفیق کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ت)

## حواشی

[یہ تمام حواشی فتاوٰی رضویہ کے جدید ایڈیشن سے ماخوذ ہیں]

۱۔ الاشباہ والنظائر، الفن الاول القاعدۃ الخامسہ، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱/۱۲۵۔

۲۔ الاشباہ والنظائر، الفن الاول، القاعدۃ الخامسہ، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱/۱۲۵

(۳) الاشباہ والنظائر، الفن الاول، القاعدۃ الخامسہ، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱/۱۱۸)
(۴) القرآن الکریم، ۲/ ۲۸۶)
(۵) القرآن الکریم، ۶۴/ ۱۶)
(۶) کشف الخفاء، حدیث ۲۳۹۸، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲/۲۰۷)
(الاشباہ والنظائر، الفن الاول، القاعدۃ الخامسۃ، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱/۱۲۳)
(۷) القرآن الکریم، ۱۶ /۱۰۶)
(۸) الاشباہ والنظائر، الفن الاول، القاعدۃ الخامسہ، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱/۱۱۸)
(۹) القرآن الکریم، ۲۲ /۷۸)
(۱۰) سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، باب من بنی فی حقہ مایضر بجارہ الخ، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ص ۱۷۰)
(مسند امام احمد بن حنبل عن ابن عباس رضی اللہ عنہما، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱/۱۰۵)
(۱۱) الاشباہ والنظائر، الفن الاول القاعدۃ الرابعۃ، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱/۱۸۹)
(۱۲) الاشباہ والنظائر، الفن الاول، القاعدۃ الرابعۃ، ۱/۱۱۷)
(۱۳) القرآن الکریم، ۲/۱۸۵)
(۱۴) الاشباہ والنظائر، الفن الاول، القاعدہ الرابعۃ عشر، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱/۱۸۹)
(۱۵) القرآن الکریم، ۵/۲)
(۱۶) صحیح البخاری، باب کیف ماکان بدء الوحی الخ، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱/۲)
(۱۷) القرآن الکریم، ۵/۱۰۵)
(۱۸) کنز العمال بحوالہ طب، ص حدیث ۱۵۰۷۷ موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۶/۱۱۳)
(الترغیب والترہیب، ترہیب الراشی والمرتشی، مصطفی البابی مصر، ۳/۱۸۰)
(۱۹) غمز عیون البصائر، القاعدۃ الخامسۃ الضرر یزال، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱/ ۱۱۹)
(۲۰) صحیح البخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ علی الفروش، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱/ ۵۶)
(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب سترۃ المصلی الخ، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱/ ۱۹۸)
(۲۱) القرآن الکریم، ۲۷/ ۳۳)
(۲۲) الاشباہ والنظائر، الفن الاول القاعدۃ الرابعۃ، ادارۃ القرآن و علوم الاسلامیہ، کراچی، ۱/ ۱۱۷)
(۲۳) رد المحتار کتاب الحج، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۲/۱۴۴)
(۲۴) فتاوٰی ہندیہ، کتاب المناسک، الباب الاول، نورانی کتب خانہ، پشاور، ۱/۲۲۱)
(۲۵) ردالمحتار، کتاب الحظر و الاباحۃ، فصل فی النظر و المس، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۵/۲۳۷)
(۲۶) جد الممتار علی ردالمحتار)
(۲۷) فتاوٰی قاضی خاں، کتاب الحظر والاباحۃ، نولکشور لکھنؤ، ۴/۷۸۰)
(۲۸) فتاوٰی قاضی خاں، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی النظر والمس، نولکشور لکھنؤ، ۴/۷۸۰)
(۲۹) فتاوٰی قاضی خاں، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی التسبیح والتسلیم الخ، نولکشور لکھنؤ، ۴/۷۹۴)
(۳۰) فتاوٰی ہندیہ، کتاب الشہادات، الباب الاول، نورانی کتب خانہ، پشاور ۳/۴۵۱)
(۳۱) بحر الرائق، کتاب القضاء، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ۶/ ۲۶۲)
(۳۲) ردالمحتار، کتاب الحج، باب الہدٰی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۲/۵۶۔۲۵۵)
(۳۳) فتح القدیر، کتاب الوقف، مکتبۂ نوریہ رضویہ، سکھر، ۵/۴۴۰)
(۳۴) فتاوٰی ہندیہ، کتاب السیر، الباب الاول، نورانی کتب خانہ، پشاور، ۲/۱۸۹)
(فتاوٰی ہندیہ، کتاب الکراہیۃ، الباب السادس والعشرون، نورانی کتب خانہ، پشاور، ۵/۶۶۔۳۶۵)
(۳۵) فتاوٰی ہندیہ، کتاب السیر، الباب الاول، نورانی کتب خانہ پشاور، ۲/۱۸۹)
(فتاوٰی ہندیہ، کتاب الکراھیۃ، الباب السادس والعشرون، نورانی کتب خانہ، پشاور، ۵ /۳۶۶)
(۳۶) مسند امام احمد بن حنبل، ترجمہ معاذ بن جبل، دارالفکر بیروت، ۵/۲۳۸)
(۳۷) المعجم الاوسط للطبرانی، ترجمہ معاذ بن جبل، مکتبۃ المعارف، الریاض، ۸/۴۶۰)

# قندیل الانوار ترجمہ جدّ الممتار

**مولانا حامد علی علیمی** (استاد جامعہ علیمیہ اسلامیہ، کراچی)

امام احمد رضا محدث بریلوی نے علوم نقلیہ وعقلیہ کی سینکڑوں کتب پر حواشی تحریر فرمائے۔ ان کے کتب خانے میں علمائے سابقین کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس پر انھوں نے حواشی نہ لکھے ہوں۔ مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامی کی شہرہ آفاق تصنیف "ردّ المحتار علی الدرّ المختار" پر بھی امام احمد رضا نے "جدّ الممتار علی ردّ المحتار" کے نام سے ضخیم اور نہایت دقیق حواشی تحریر فرمائے۔ جو کراچی سے تخریج و تحقیق کے ساتھ مرتب ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔ اس عربی تصنیف کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ و تشریح مفتی غلام یسین امجدی علیہ الرحمۃ نے کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ مولانا حامد علی علیمی نے کتاب الصلوۃ سے آگے ترجمہ شروع کیا ہے۔ گزشتہ شمارے کے تسلسل میں ترجمے کی نئی قسط پیشِ خدمت ہے قارئین اپنی آراء اور مفید مشوروں سے نوازیں نیز طلبہ و محققین سے گزارش ہے کہ امام احمد رضا کی اس تصنیف کو اپنا موضوعِ تحقیق بنائیں۔ (عبید)

**قولہ:** اس کے پیچھے اندھیرا ہوتا ہے:

**قال الرضا:** علامہ شامی نے اس میں ابن امیر الحاج کی اتباع کی اور یہ سہو (بھول سے ہوا) ہے، اس غلطی کا باعث "منیۃ المصلی" کا "محیط" سے روایت کردہ یہ قول ہے کہ صبح کاذب یہ ہے کہ سفیدی ایک طرف واقع ہو پھر ختم ہو جائے، اھ۔

**اقول:** (میں کہتا ہوں) ابن امیر الحاج کی مراد صبحِ صادق کی سفیدی کے غلبہ سے، صبحِ کاذب کا ختم ہونا ہے، جیسے فجر، طلوعِ آفتاب سے ختم ہو جاتی ہے۔

**قولہ:** علامہ شامی محقق علی آفندی داغستانی کے رسالہ "اسطر لاب" پر علامہ شیخ خلیل کاملی کے حاشیہ سے نقل کرتے ہوئے فائدہ بیان کرتے ہیں کہ صبح صادق و کاذب اور اسی طرح شفقِ احمر وابیض کے درمیان تفاوت تین درجوں کا ہوتا ہے:

**قال الرضا:** شرح چغمینی میں ہے: "بے شک میں نے تجربہ سے جانا کہ صبح کا اوّل اور شفق کا آخری وقت اس وقت ہوتا ہے جب سورج ۱۸ درجہ پر ہو"۔ حاشیہ برجندی میں ہے: "یہ صبح کاذب کی ابتداء کے بارے میں ہے، جہاں تک صبحِ صادق کی ابتداء کا تعلق ہے تو ایک قول یہ ہے کہ اس وقت سورج ۱۵ درجہ پر ہو، واللہ تعالیٰ اعلم" اھ۔

**اقول:** (میں کہتا ہوں) یہ ان علامہ جیسی شخصیت سے بہت زیادہ عجیب بات ہے گویا کہ ان کا تجربہ اور مشاہدہ موافق نہیں ہیں، اور حق یہ ہے کہ صبحِ صادق کی ابتداء اور شفقِ ابیض کی انتہا، سورج کے ۱۸ درجہ پر ہونے سے ہوتی ہے، اسی کی گواہی مسلسل مشاہدوں اور تجربوں نے دی ہے، رہی صبحِ کاذب تو وہ اس (صبحِ صادق) سے بہت پہلے ہوتی ہے اور مجھے اسکی ابتداء کا (صحیح) تجربہ نہ ہو سکا۔

**قولہ:** علامہ شامی متن کے قول "اور ظہر کا وقت زوال سے لے کر سائے کے دو مثل ہونے تک ہے" کی تائیدات پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اور یہی صحیح ہے، بدائع، محیط، ویناییع۔۔۔ الخ"

**قال الرضا:** ("محیط" سے مراد ہے) محیط سرخسی۔

**قولہ:** "ینابیع":

**قال الرضا:** قدوری کی شرح ہے۔

**قولہ:** غیاثیہ میں ہے: "اور یہی مختار ہے"

**قال الرضا:** اور یہ جواہر اخلاطی میں بھی ہے۔

**قولہ:** اور اسی کو امام محبوبی نے اختیار کیا:

**قال الرضا:** خانیہ اور خلاصہ میں اسے مقدم کیا، اور وہ اَظہر واَشہر قول کو ہی مقدم کرتے ہیں، اور ہدایہ اور کافی میں اس کی دلیل کو مؤخر ذکر کیا اور یہ دونوں مختار قول کی دلیل آخر میں ذکر کرتے ہیں، ہدایہ میں کہا کہ "جب آثار میں تعارض ہے تو محض شک سے وقت نہیں گزرے گا"، اھ۔ کافی میں یہ زائد ہے کہ عصر کا وقت جب تک ثابت ہے تو محض شک سے مغرب کا وقت نہیں آئے گا، اھ۔ خزانۃ المفتین میں دوسرے قول کی طرف التفات کیے بغیر اسی پر اکتفا کیا۔ مراقی الفلاح میں ہے: "یہی صحیح ہے اور اسی پر اجلّہ مشائخ اور متون ہیں اھ"۔ اور اسی میں یہ بھی ہے: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ اکثر مشائخ سائے کے دو مثل پہنچ جانے کی شرط کے قائل ہیں اور یقینی طور پر بری الذمہ ہونے کے لیے اسے اختیار کرنا ہی احوط ہے، کیونکہ وقت

**(باقی صفحہ نمبر 7 پر ملاحظہ فرمائے)**

# تعارف "انہار الانوار من یم صلاۃ الاسرار" (۱۳۰۵ھ)

ملک العلما مولانا ظفر الدین قادر فاضل بہار رحمۃ اللہ علیہ

وہابیہ کی شر کی داستان صرف ایک یا دو مسئلہ پر منحصر نہیں بلکہ جس جگہ انبیا و اولیا کی تعظیم و تکریم ہوتی دیکھی، وہیں شرک جما دیا۔ صوفیائے کرام خصوصاً مشائخ قادریہ کا ایک زمانہ قدیم سے معمول و مجرب عمل، قضائے حاجت و حصول مراد کے لیے صلاۃ غوثیہ ہے۔

حسن نیت ہو خطا پھر کبھی کرتا ہی نہیں
آزمایا ہے یگانہ ہے دوگانہ تیرا

مگر وہابیہ کے لیے زہر ہلاہل ہے۔ گنگوہی صاحب کے فتاویٰ حصہ اوّل ص ۴۷ پر ایک سوال ہے: "صلاۃ غوثیہ اکثر مشائخوں میں مروج ہے اس کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟" [یہ ذہن میں رہے کہ سائل مسئلہ شرعیہ پوچھتا ہے، نہ ذاتی رائے۔ لیکن گنگوہی صاحب جواب میں فرماتے ہیں: "بندہ اس کو پسند نہیں کرتا، اور نہ جائز مانے۔" [جناب] سائل کا سوال آپ کی پسندیدگی یا ناپسند کرنے سے نہ تھا اور نہ یہ سوال تھا کہ آپ اس کو جائز جانتے ہیں، یا نہیں۔ لیکن کمال حیاداری سے یہ جواب آپ نے عنایت فرمایا۔ سچ کہا کسی نے۔

کیوں حیا کا لگائیں دل میں گھن
بے حیا باش وہر چہ خواہی کن

خصوصاً جب سائل نے لکھا تھا کہ اکثر مشائخوں میں مروج ہے، تو یا اس کا رد کیے ہوتے کہ یہ بات غلط ہے، ورنہ مشائخ کے معمول کے سامنے سر جھکانا تھا۔ یا اگر اس کی حرمت و ناجوازی قرآن و حدیث سے آپ کے علم میں تھی، تو اس کو لکھ کر سائل کو فائدہ پہنچانا تھا۔

پھر [فتاویٰ رشیدیہ کہ] اسی حصہ کے صفحہ ۱۲۳ پر ایک سوال ہے: "صلاۃ غوثیہ جو اکثر عوام پڑھتے ہیں جائز ہے یا نہیں اور صلاۃ معکوس وصلاۃ ہول بھی جائز ہے یا نہیں؟" اس کا جواب تحریر کیا: "صلاۃ غوثیہ کی حقیقت ہم کو معلوم نہیں۔ اور صلاۃ معکوس فی الحقیقت نماز نہیں، بلکہ مجاہدہ ہے۔ اور صلاۃ ہول کا ثبوت صحاح احادیث سے نہیں۔" جب نمازِ غوثیہ کی فضیلت جناب کو معلوم ہی نہیں پھر ص ۸۴ پر ناپسند کیوں کیا اور ناجائز کیوں بتایا؟ حکم دینے کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے: اول اس کی حقیقت معلوم ہونی، پھر شرع سے حرمت و ممانعت کا ثبوت۔ جب حقیقت ہی نہیں معلوم، تو مجہول پر حکمِ ممانعت لگانا جہالت نہیں تو کیا ہے؟ وہ تو خدا کو بہت اچھا کرنا تھا کہ مولوی صاحب خوش قسمتی سے صلاۃ غوثیہ کو جانتے ہی نہیں؛ ورنہ شرک کا فتویٰ دینے سے کسی طرح باز نہیں رہتے۔ اس لیے کہ صلاۃ غوثیہ کہ صلاۃ غوثیہ میں بعد دو رکعت نماز پڑھنے کے حضور اقدس ﷺ پر درود و سلام عرض کرنا ہوتا ہے اور گیارہ مرتبہ یا رسول اللہ یا نبی اللہ اغثنی امددنی فی قضاء حاجتی یا قاضی الحاجات کہنا، اس کے بعد ۱۱ قدم بغداد شریف کی طرف چلنا ہوتا ہے اور ہر قدم پر یا غوث الثقلین و یا کریم الطرفین اغثنی وامددنی فی قضاء حاجتی یا قاضی الحاجات کہنا ہوتا ہے اور مولوی صاحب کے فتاویٰ سے ثابت کہ ندا بالغیر اور استعانہ و امداد بالغیر سب شرک ہیں۔

فتاویٰ رشیدیہ حصہ سوم صفحہ ۶ میں ہے: "اور مدد مانگنا اولیا سے حرام ہے مدد حق تعالیٰ سے مانگنی چاہیے سوائے حق تعالیٰ کے کوئی مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا سو غیر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا اگرچہ ولی یا نبی ہو شرک ہے۔"

نیز اسی حصہ کے ص ۷ پر ہے: "اور جب انبیا علیہم السلام کو علمِ غیب نہیں تو یا رسول اللہ کہنا بھی ناجائز ہوگا۔ اگر یہ عقیدہ کر کے کہے کہ وہ دور سے سنتے ہیں بسبب علمِ غیب کے تو وہ خود کفر ہے۔" مقامِ غور ہے کہ جب یا رسول اللہ کہنا ناجائز ہے، تو یا غوث الثقلین و یا کریم الطرفین کہنا کیوں کر جائز ہوگا؟ اور اگر ولی اللہ کو بھی علمِ غیب مان کر دور سے سننے کا عقیدہ رکھ کر کہا، تو خود کفر ہونے میں کیا شبہہ رہا؟ واقعی مولوی ہو تو ایسا مشرک گر، کافر ساز کہ بات کا بتنگڑ کر کے خواہ مخواہ کفر و شرک تک نہ پہنچائے، تو اسے چین نہ آئے۔

اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنت قدس سرہ نے اس مسئلے کی تحقیق میں دو رسالے تحریر فرمائے۔ ایک اردو میں پچاس صفحے کا، جس کا سوال ربیع الاول شریف ۱۳۰۵ھ میں جناب مستطاب مولوی حافظ شاہ

سراج الحق محمد عمر صاحب قادری نے دہلی کھڑ کی فراش خانہ سے بھیجا تھا، جس کا نامِ تاریخی "انہار الانوار من یم صلاۃ الاسرار" (۱۳۰۵ھ) ہے۔ دوسرا رسالہ عربی میں بارہ صفحے کا، جس کا تاریخی نام "ازھار الانوار من صبا صلاۃ الاسرار" (۱۳۰۵ھ) ہے۔ جبکہ مولانا شاہ محمد ابراہیم صاحب قادری مدراسی حیدر آبادی نے اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت سے صلاۃ غوثیہ کی اجازت چاہی تھی۔ یہ رسالہ گویا اجازت نامہ صلاۃ غوثیہ یعنی صلاۃ الاسرار کا ہے، جو اعلیٰ حضرت نے مولانا شاہ ابراہیم صاحب موصوف کو عطا فرمایا تھا۔ رسالہ اولیٰ یعنی "انہار الانوار" میں بعد نقل سوال ابتدائے جواب حسبِ دستور خطبہ عربیہ فصیحہ بلیغہ سے کیا ہے۔ الفاظِ کریمہ حمد ونعت کے یہ ہیں: الحمد للہ علی حسن بلائہ۔ ملأ ارضہ و ملأ سمائہ۔ وملا ماشاء فی قدرہ وقضائہ۔ والشکر للمصطفی علی نعمائہ۔ شکرا یوافی حسن الائہ۔ ویکافی عنا مزید عطائہ۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی ابنائہ۔ وازواجہ و اصحابہ واحبائہ۔ و وارث علمہ ومجدہ و سنائہ۔ غوثنا الاعظم رافع لوائہ۔ ومشائخنا الکرام وسائر اولیائہ۔ صلاۃ تکشف لنا الاسرار۔ وتصرف عنا اذی الاشرار۔ وتکون عدۃ لیوم لقائہ۔ الخ فی الواقع یہ مبارک نماز حضرات عالی مشائخ کرام قدست اسرارہم العزیزہ کی معمول، اور قضائے حاجات وحصول مرادات کے لیے عمدہ طریق مرضی ومقبول اور حضور پر نور غوث الثقلین، غیاث الکونین صلوات اللہ وسلامہ علی جدہ الکریم وعلیہ سے مروی ومنقول۔ اجلۂ علما واکابر کملا اپنی تصانیفِ عالیہ میں اسے روایت کرتے اور مقبول ومقرر ومسلم ومعتبر رکھتے آئے۔ امام اجل ہمام ابجل سیدی ابوالحسن نور الدین بن جریر لخمی شطنوفی نے بسند خود "بہجۃ الاسرار شریف" میں اور شیخ شیوخ علماء الہند شیخ محقق مولانا عبدالحق محدث دہلوی نور اللہ مرقدہ "زبدۃ الأثار" لطیف میں اور دیگر علمائے کرام وکملائے عظام رحمہم اللہ تعالیٰ اپنے اسفارِ منیف میں اس جناب ملائک رکاب علیہ رضوان العزیز الوھاب سے راوی و ناقل کہ حضور نے فرمایا: "جو بعدِ مغرب دو رکعت نماز پڑھے، ہر رکعت میں بعدِ فاتحہ سورۂ اخلاص گیارہ بار، پھر بعدِ سلام نبی ﷺ پر صلاۃ وسلام عرض کرے۔ پھر عراق شریف کی طرف گیارہ قدم چلے اور میرا نام اور اپنی حاجت ذکر کرے، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس کی مراد پوری ہو۔" اسی طرح امامِ جلیل عبداللہ یافعی مکی صاحب "خلاصۃ المفاخر فی اختصار مناقب الشیخ عبدالقادر" نے روایت کی۔ یو ہیں فاضلِ کامل مولانا علی قاری نے "نزھۃ الخاطر" میں ذکر فرمایا۔ "زبدۃ الآثار" میں اپنے شیخ واستاذ کا اس نماز کی اجازت دینا، اور اپنا اجازت لینا، بیان کیا۔ اور شیخ محقق سے اس نمازِ مبارک میں خاص ایک رسالۂ نفیس عجالہ ہے۔ اس سے ثابت کہ شیخ عبد الوہاب متقی مکی نے کتاب "بہجۃ الاسرار" کو معتمد ومعتبر اور اس مبارک نماز کو مسلم ومقرر فرمایا۔ اور مولانا شیخ وجیہ الدین علوی استاد شیخ محقق وتلمیذ و مرید حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری نہایت شدومد سے اس نمازِ مبارک کی اجازت دیتے اور اس پر بتاکید اکید تحریص وترغیب فرماتے۔ یونہی شیخ محقق نے "اخبار الاخیار شریف" اور مولانا ابوالمعانی محمد مسلمی نے "تحفۂ شریفہ" اور حضرت سیدنا شاہ حمزہ عینی مارہروی قدس سرہ نے "کاشف الاستار شریف" میں اسے نقل وارشاد فرمایا۔ اور امام یافعی تصریح فرماتے ہیں کہ حضورِ پرنور غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کے اصحاب کرام اس نماز کو عمل میں لاتے اور "زبدۃ الآثار" میں اولیائے طریقۂ عالیہ قادریہ کے آداب میں فرمایا: "وملا زمۃ صلاۃ الاسرار التی بعدہ التخطی احدی عشرۃ خطوۃ یعنی اس خاندان پاک کے آداب سے ہے صلاۃ الاسرار کی مداومت کرنی جس کے بعد گیارہ قدم چلنا ہے۔ بایں ہمہ اس کا اعمال مشائخ کرام سے ہونا، آفتاب سے زیادہ روشن ہے، اور اس کا انکار مہر نیم روز وماہ نیم ماہ کا انکار ہے۔" امام ابن الجزری صاحب "حصن حصین" اس جناب کے سلسلۂ تلامذہ میں سے ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب "بہجۃ الاسرار شریف" اپنے شیخ سے پڑھی، اور اس کی سند واجازت حاصل کی۔ اپنے رسالہ "طبقات القراء" میں فرماتے ہیں: "میں نے یہ کتاب "بہجۃ الاسرار" مصر میں خزانۂ شاہی سے حاصل کر کے شیخ عبد القادر سے، کہ اکابر مشائخ مصر سے تھے، پڑھی اور انھوں نے مجھے اس کی روایت کی اجازت دی۔" بالجملہ ایسے اکابر کی روایاتِ معتمدہ کو بے وجہ وجیہہ رد کرنا، سخت جہالت ہے۔ یا خبث وضلالت۔ اور بے دلیل دعوی الحاق محض مردود۔ ورنہ تصانیف ائمہ سے امان اٹھ جائے اور نظام شریعت درہم برہم نظر آئے۔ جو سند پیش کیجیے، مخالف کہہ دے کہ یہ الحاقی ہے۔ چلیے تمسک واستناد کا دروازہ ہی بند ہو گیا۔

اس نماز کو قرآن وحدیث کے خلاف بتانا، محض بہتان وافترا، ہرگز قران وحدیث میں اس کی ممانعت نہیں، نہ مخالف کوئی آیت یا حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتا ہے۔ ان ذی ہوشوں کے نزدیک امر ونہی میں کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اور عدمِ ذکر ذکرِ عدم ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ ''الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو عفا عنہ'' حلال وہ ہے جسے خدا نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس سے سکوت کیا وہ عفو ہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ والحاکم عن سلیمان الفارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ بالجملہ یہ فائدہ نفیسہ ہمیشہ یاد رکھنے کا ہے کہ قرآن وحدیث سے جس چیز کی بھلائی یا برائی ثابت ہو، وہ بھلی یا بری ہے اور جس کی نسبت کچھ ثبوت نہ ہو، وہ معاف ہے، جائز ومباح ہے۔ اس کا کرنا درست وروا ہے اور اس کو حرام، گناہ، نادرست وممنوع کہنا، شریعتِ مطہرہ پرافترا۔ قال تعالیٰ: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ o ؕ (سورۂ نحل، آیت ۱۱۶)

اسی طرح اس نماز کو طریقۂ خلفائے راشدین وصحابہ کرام کے مخالف کہنا بھی اسی سفاہتِ قدیمہ پر مبنی، کہ جو فعل ان سے منقول نہ ہو، وہ ان کے نزدیک ممنوع تھا۔ حالانکہ عدمِ ثبوتِ فعل وثبوتِ عدمِ جواز میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ علامہ خطیب قسطلانی مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں: '' الفعل دیل علی الجواز وعدم الفعل لا یدل علی المنع۔'' شاہ عبد العزیز ''تحفہ اثنا عشریہ'' میں فرماتے ہیں: ''نہ کردن چیزے دیگر ست ومنع فرمودن چیزے دیگر، ملخصًا۔'' اور اسے خلاف اخلاص وتوکل ماننا نری جہالت ہے۔ اس میں محبوبانِ خدا کی طرف توجہ بغرضِ توسل ہے، اور ان سے توسل قطعاً محمود، اور ہرگز اخلاص وتوکل کے منافی نہیں۔ قال تعالیٰ: وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ o ؕ اللہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈو اور اس کی راہ میں کوشش کرو کہ تم مراد کو پہنچو۔ اور انبیاو ملائکہ علیہم السلام کی نسبت فرماتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ o ؕ وہ ہیں کہ دعا کرتے اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈھتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عمر فاروقِ اعظم کا طلبِ باراں میں، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے توسل کرنا، صحیح بخاری شریف میں مروی ومشہور۔ حصنِ حصین میں ہے: ''وان یتوسل الی اللہ تعالیٰ بانبیائہ خ روالصالحین من عبادہ خ'' یعنی آداب دعا سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے انبیا سے توسل کرے۔ اسے بخاری وبزار نے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، اور اللہ کے نیک بندوں کا وسیلہ پکڑے۔ اسے بخاری نے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ اور سب سے زیادہ وہ حدیث صحیح معروف ومشہور ہے، جسے نسائی، ترمذی، ابنِ ماجہ، حاکم، بیہقی، طبرانی، ابن خزیمہ نے عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ اور طبرانی وبیہقی نے صحیح اور ترمذی نے حسن، غریب، صحیح، اور حاکم نے بر شرط شیخین صحیح کہا اور امام منذری ودیگر ائمہ نقد وتنقیح نے اس کی تصحیح کو مسلم رکھا۔ حضورِ اقدس ﷺ نے ایک نابینا کو دعا تعلیم فرمائی کہ بعد نماز کہے: اللھم انی اسئلك واتوجہ الیك بنبیك محمد نبی الرحمۃ یا محمد انی اتوجہ بك الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی لی اللھم فشفعہ فی الٰہی! میں تجھ سے مانگتا اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں بوسیلہ تیرے نبی محمد ﷺ کے کہ مہربانی کے نبی ہیں۔ یا رسول اللہ! میں حضور کے وسیلے سے اپنے رب کی طرف اس حاجت میں توجہ کرتا ہوں کہ میری حاجت روا ہو۔ الٰہی ان کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما۔ اور لطف یہ کہ بعض روایاتِ ''حصن حصین'' لتقضی لی بصیغہ معروف واقع ہوا۔ یعنی یا رسول اللہ! میں آپ کے توسل سے خدا کی طرف توجہ کرتا ہوں کہ آپ میری حاجت روائی کریں۔

**تنبیہ:** حضراتِ منکرین کی حیاداری دیکھنے کے قابل۔ اس حدیث جلیل کی جلالت شان تصریحات علما سے ظاہر وباہر، اور اس سے جواز استمداد والتجا محبوبان خدا سے روشن وواضح، جس سے معاند سے معاند کو بھی انکار کی مجال نہیں۔ ناچار نواب قطب الدین خان دہلوی مصنف ''ظفر جلیل'' نے ''ترجمہ حصن حصین'' میں حاشیہ کتاب پر یوں ہرزہ سرائی کی: ''یک راوی ایں حدیث عثمان ابن خالد بن عمر بن عبد اللہ متروک الحدیث ست چنانکہ در تقریب موجود ہست وحدیث راوی متروک الحدیث قابل حجت نمی شود۔'' اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَo ؕ انصاف ودیانت کا تو مقتضا یہ تھا کہ جب حق واضح ہوگیا تھا، تسلیم فرماتے۔ نہ کہ خواہی نخواہی بزور تحریف ایسی صحیح رجیح حدیث کو، جس کی اس قدر ائمہ محدثین نے یک زبان تصحیح فرمائی، معاذ اللہ ساقط ومرد

ود قرار دیجیے اور انتقام خدا و مطالبہ حضور سیدِ روزِ جزا علیہ التحیۃ والثنا کا کچھ خیال نہ کیجیے۔ اب حضرت منکرین کے تمام ذی علموں سے انصاف طلب کہ اس حدیث کا راوی عثمان بن خالد بن عمر بن عبد اللہ متروک الحدیث ہے، جس سے ''ابن ماجہ'' کے سوا کتبِ صحاحِ ستہ میں کہیں روایت نہیں، یا عثمان بن عمر بن فارس عبدی بصری ثقہ جو ''صحیح بخاری'' و ''صحیح مسلم'' وغیرہا تمام صحاح کے رجال سے ہیں۔ کاش! اتنا ہی نظر فرمالیتے کہ جو حدیث کئی صحاح میں مروی اس کا مدارِ روایت، وہ شخص کیونکر ممکن، جو ''ابن ماجہ'' کے سوا کسی کے رجال سے نہیں۔ اور سنیے! امام طبرانی سیدنا عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ سے راوی حضورِ اقدس ﷺ فرماتے ہیں: اذا ضل احدکم شیا او اراد عونا وھو بارض لیس بھا انیس فلیقل یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی فان للہ عبادا لا یراھم، جب تم میں کوئی شخص سنسان جگہ میں بہکے، بھولے، یا کوئی چیز گم کرے، اور مدد مانگنی چاہے، تو یوں کہے: اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔ ''اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔ اے اللہ کے بندوں! میری مدد کرو کہ اللہ کے کچھ بندے ہیں، جنھیں یہ نہیں دیکھتا۔'' راویِ حدیث نے فرمایا: ''جرب ذالک۔''

فاضل علی قاری علامہ میرک سے، اور وہ بعض علمائے ثقات سے ناقل ھذا حدیث حسن۔۔۔ اور فرمایا: مشائخ کرام سے مروی ہوا انہ مجرب قرن بہ النجح یہ مجرب ہے اور مراد ملنی اس کے ساتھ مقرون۔ لطف یہ کہ یہاں بھی نواب صاحب موصوف نے اپنے زورِ علم و دیانت و جوشِ تقویٰ و امانت کا جلوہ دکھایا۔ فرماتے ہیں: ''اس حدیث کے راویوں سے عتبہ بن غزوان مجہول الحال ہے، تقویٰ اور عدالت اس کی معلوم نہیں جیسا کہ کہا ہے تقریب میں کہ نام ہے ایک کتاب کا اسماء الرجال کی کتابوں سے۔'' خدا کی شان! کہاں عتبہ بن غزوان رقاشی کہ طبقہ ثالثہ سے ہیں، جنھیں تقریب میں مجھول الحال، اور میزان میں لا یعرف کہا اور کہاں اس حدیث کے راوی عتبہ بن غزوان ابن جابر مازنی بدری کہ سید عالم ﷺ کے صحابی جلیل القدر مہاجر و مجاہدِ غزوۂ بدر ہیں۔ جن کی جلالتِ شان بدر سے روشن مہر سے ابین۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہ عنا۔ مترجم صاحب دیباچہ ترجمے میں معترف کہ ''حرز ثمین'' ان کے پیش نظر ہے، اس میں یہ عبارت موجود ہے۔ رواہ الطبرانی عن زید بن علی عن عتبۃ بن غزوان رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ اور اسی طرح جس تقریب کا حوالہ دیا ہے، اس میں خاص برابر کی سطر میں یہ تحریر تو نہ تھی۔ عتبۃ بن غزوان بن جابر المزنی صحابی جلیل مہاجر بدری مات سنۃ سبع عشر اھ (ملخصًا) پھر کون سے ایمان کا مقتضی ہے کہ اپنے مذہبِ فاسد کی حمایت میں ایسے صحابی جلیل الشان، رفیع المکان کو بزور زبان و زور جنان درجہ صحابیت سے طبقہ ثالثہ میں لاڈالیے؟ اور شمسِ عدالت وبدرِ جلالت کو معاذ اللہ مردود الروایۃ و مطعون جہالت بنانے کی بدراہ نکالیے؟ سچ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: اذالم تستحی فاصنع ماشئت۔

کیوں حیا کا لگائیں دل میں گھن
بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن

مسلمان دیکھیں! کہ حضراتِ منکرین انکارِ حق واصرار باطل میں کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔ رہا اس نماز مبارک کے افعال پر کلام، تو:

**اولاً:** جب اس کی ترکیب خود حضور پر نور غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے ثابت تو مدعی تسنن کو انکار کی کیا گنجائش؟

**ثانیاً:** وہ علما و اولیا جن میں بعض کے نام سابق میں مذکور ہوئے، جنھوں نے یہ نماز پسند کی، اجازت دی، سندلی، خود پڑھی۔ منکرین میں کون ان کے پائے کا ہے۔ پھر ان کے کہے سے کیوں کر مسلم ہو کہ حکمِ شرع پر یہی چلے اور وہ سب معاذ اللہ گنہگار فساق بدعتی گزرے اور ان اکابر کو غیر موثوق کہہ کر اتباعِ سوادِ اعظم کی طرف بلانا وہی پرانی تلبیس ہے۔

**ثالثاً:** ان صاحبوں کے اصول پر (بطور معارضہ بالقلب) اس نمازِ مبارک پر انکار روا نہیں اور جس پر انکار روا نہیں، وہ اقل درجہ مباح ہو گا۔ اس لیے کہ ان حضرات کے مذہب میں عدمِ ذکر ذکرِ عدم ہے اور کلماتِ ائمہ میں اس نماز پر انکار جائز ہو گا، ہر گز مذکور نہیں۔ ومن ادعی فعلیہ البیان اور عدم بیان بیان عدم تو لاجرم اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ سب ائمہ کے نزدیک اس نماز پر انکار روا نہیں اور جس پر انکار روا نہیں، تو کم سے کم وہ مباح ضرور ہو گا۔ فثبت المقصود وبھت الھنود۔

**رابعاً:** ان حضرات کی عجیب حالت ہے جو از کہ عقلاً و نقلاً محتاج

دلیل نہیں ہے، بے دلیل خاص قبول نہیں کرتے۔ اور عدم جواز کے لیے ان کے زبانی دعویٰ کافی ہو جاتے ہیں۔ اس نماز میں جو جو باتیں ہیں ان کا ثبوت لیجیے۔

[۱] محبوبانِ خدا کی نفسِ تعظیم بے شک اہم واجبات و اعظم قربات سے ہے۔ قال تعالیٰ: وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ o وقال تعالیٰ ''وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ o''

[۲] ان کے لیے بہیئت نماز قیام۔ علمائے دین نے روضۂ منورہ کے حضور خاص بہیئت نماز قیام کرنے کا حکم دیا۔ اختیار شرح مختار و فتاوٰی عالمگیری میں ہے۔ يتوجه الى قبره صلى الله تعالىٰ عليه وسلم ويقف كما يقف فى الصلاة یعنی قبر شریف سیدِ عالم ﷺ کی طرف توجہ کرے اور یوں کھڑا ہو جیسے نماز میں کھڑا ہوتا ہے۔

اے عزیز! اصل کار یہ ہے کہ محبوبان خدا کے لیے جو تواضع کی جاتی ہے، وہ درحقیقت خدا ہی کے لیے تواضع ہے۔ ولہٰذا بکثرت احادیث میں استاذ و شاگرد و علما و عام مسلمین کے لیے تواضع کا حکم ہوا۔ طبرانی ''معجم اوسط'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً راوی تعلموا العلم تعلموا للعلم السكينة والوقار وتواضعوا لمن تعلمون منه علم سیکھو اور علم کے لیے سکون و مہابت سیکھو اور جس سے علم سیکھتے ہو اس کے لیے تواضع کرو۔ خطیب نے ''کتاب الجامع'' میں حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً یوں روایت کی۔ تواضعوا لمن تعلمون منه وتواضعوا لمن تعلمونه ولا تكونوا جبابرة العلماء فيغلب جهلكم علمكم o جس سے علم سیکھتے ہو اس کے لیے تواضع کرو اور متکبر عالم نہ بنو کہ تمھارا جہل تمھارے علم پر غالب ہو جائے۔ بایں ہمہ علما نے تصریح فرمائی کہ غیر خدا کے لیے تواضع حرام ہے۔ فتاوٰی ھندیہ میں ہے: التواضع لغير الله حرام كذا فى الملتقط۔ تو بات وہی ہے کہ انبیا، علما و مسلمین کے واسطے تواضع اس لیے ہے کہ وہ اللہ کے نبی ہیں، یہ اللہ کے ولی ہیں۔ وہ دین الٰہی کے قیم ہیں، یہ ملت الٰہیہ پر قائم ہیں۔ تو علتِ تواضع، جب وہ نسبت ہے، جو انھیں بارگاہِ الٰہی میں حاصل، تو یہ تواضع بھی درحقیقت خدا ہی کے لیے ہوئی۔ جیسے صحابہ کرام و اہلِ بیتِ عظام کی محبت و تعظیم بعینہٖ محبت و تعظیم سیدِ عالم ﷺ ہے۔ تواضع لغیر اللہ کی شکل یہ ہے کہ عیاذاً باللہ کسی کافر یا دنیا داری غنی کے لیے اس کے غنا کے سبب تواضع ہو کہ یہاں وہ نسبت موجود ہی نہیں یا موجود ہے تو ملحوظ نہیں۔

[۳] محبوبانِ خدا کے لیے خشوع و خضوع۔ ابوداؤد و نسائی و ترمذی و ابن ماجہ، اسامہ بن شریک سے راوی: قال اتيت النبى صلى الله تعالىٰ عليه وسلم واصحابه حوله كان على رؤسهم الطير میں سیدِ عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا حضور کے اصحاب ارد گرد تھے، گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔یعنی سر جھکائے، گردنیں خم کیے، بے حس و حرکت کہ پرندے لکڑی یا پتھر جان کر سروں پر آبیٹھیں۔ اس سے بڑھ کر اور خشوع کیا ہو گا؟ اسی طرح مولانا جامی نفحات الانس میں حضور غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ایک دعوت میں تشریف لے جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: واهل المجلس كان على رؤسهم الطير یعنی اہلِ مجلس کہ تمام اولیا، علما، و عمائد بغداد تھے۔ ہیبتِ سرکار قادریت کے سبب ایسے بیٹھے تھے، گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں۔

[۴] رسول اللہ ﷺ کے ذکر کے وقت خشوع و خضوع۔ امام ابوابراہیم تجیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب حضورِ اقدس ﷺ کو یاد کرے، یا اس کے سامنے حضور کا ذکر آئے، خشوع و خضوع بجا لائے، اور باوقار ہو جائے، اور اعضا کو حرکت سے باز رکھے اور حضور کے لیے اس ہیبت و تعظیم کی حالت پر ہو جائے، جو حضورِ اقدس ﷺ کے روبرو اس پر طاری ہوتی اور ادب کرے، جس طرح خدا نے ہمیں ان کا ادب سکھایا۔

[۵] صورتِ اقدس کا تصور باندھے۔ ''شرح مختار'' اور ''فتاوٰی عالمگیری'' میں ہے: ويقف كما يقف فى الصلاة کے آگے ہے۔ وتمثيل سورة الكريمة البهية ملخصاً یعنی اور حضور کی صورت مبارک کا تصور باندھے۔ امام شہاب الدین خفاجی ''نسیم الریاض'' میں امام تجیبی کے قول کے نیچے لکھتے ہیں: یعنی یاد حضور کے وقت یہ قرار دے کہ میں حضورِ اقدس ﷺ کے روبرو حاضر ہوں، اور حضور کا خیال کرے، اور صورت اقدس کا تصور باندھے، گویا حضور کے سامنے حاضر ہے۔ امام قاضی عیاضی، امام تجیبی کا قول نقل کرکے فرماتے ہیں: ہمارے سلف صالح و ائمہ سابقین کا یہی ادب و طریقہ تھا اور فرماتے ہیں: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جب سید عالم ﷺ کا ذکر کرتے، رنگ

ان کا بدل جاتا اور جھک جاتے۔ ''نسیم الریاض'' میں ہے۔ لشدۃ خشوعہ یہ جھک جانا بسبب شدتِ خشوع تھا۔

ان احادیث و روایات و کلمات طیبات سے کالشمس فی وسط السماء روشن و آشکار ہو گیا کہ ہنگام توسل محبوبانِ خدا کی طرف منھ کرنا چاہیے۔ اگرچہ قبلہ کو پیٹھ ہو۔ اور دل کو خوب ان کی طرف متوجہ کرے، یہاں تک کہ ہر ایں و آں دل سے محو ہو جائے اور ان کے لیے خشوع و خضوع محمود و مشروع۔ فقیر حیران ہے کہ اس نمازِ مبارک میں اوّل تو صلاۃِ مفروضہ کے بعد قبلے سے انحراف کہاں؟ اور ہو بھی تو اس میں کیا گناہ ہے؟ ہر نمازِ مفروضہ کے بعد امام کو قبلے سے انحراف سنتِ معلومہ ہے۔ پھر اسے ممانعت میں کیا مداخلت؟ ہاں جو کچھ غیظ وغضب کرنا ہو، تعیین سمت پر کیجیے۔ اس کا جواب مرزا مظہر جان جاناں شہید سے لیجیے۔ مرزا صاحب اپنے مکتوبات میں ایک ایک مرید رشید کو تحریر فرماتے ہیں:

''فقیر انشاء اللہ تعالیٰ بعد نماز یک دو گھڑی روز بر آمدہ پیش از حلقہ یا بعد آں بجانب آں مستورہ شماں متوجہ خواہد شد باید کہ ہر روز منتظر و متوقع فیض روبایں طرف کردہ، بعد نماز صبح بنشینید کہ محبت ایں عفیفہ کہ فرزند ماست دردل فقیر تاثیر کردہ ست۔'' دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں: ''ہر صبح بعد نماز متوجہ بفقیر بنشینید بے ناغہ توجہ می دہم۔'' شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک رباعی لکھی ہے:

انانکہ زاوناس بہی جستند
بالجبہ انوار قدم پیوستند
فیض قدس از ہمت ایشاں میجو
دروازۂ فیض قدس ایشاں ہستند

پھر اس کی شرح میں لکھا: ''یعنی توجہ بارواحِ طیبہ مشائخ در تہذیب روح و سر نفع بلیغ دارد۔ انھیں شاہ صاحب نے ہمعات میں حدیثِ نفس کا یوں علاج بتایا: ''بارواح طیبۂ مشائخ متوجہ شود و برائے ایشاں فاتحہ خواند بزیارت قبر ایشاں رود و از انجا انجذاب دریوزہ کند۔'' علامہ ابن حجر مکی ''خیرات الحسان فی مناقب الامام ابی حنیفۃ النعمان'' میں فرماتے ہیں: ''ہمیشہ سے علما و اہل حاجت، امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے مزارِ مبارک کی زیارت اور اپنی حاجت روائیوں کو بارگاہِ الٰہی میں ان کے توسل سے پیش کرتے ہیں اور اس سبب سے فوراً مراد پاتے ہیں۔

انھیں میں سے امام شافعی ہیں کہ فرماتے ہیں کہ میں ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے تبرک کرتا اور ان کی قبر پر جاتا ہوں اور جب مجھے کوئی حاجت پیش آتی ہے، دو رکعت نماز پڑھتا اور ان کی قبر کی طرف آکر خدا سے سوال کرتا ہوں۔ کچھ دیر نہیں گزرتی کہ حاجت روا ہوتی ہے۔'' فقیر کہتا ہے: غفر اللہ تعالیٰ لہ یہاں نکات غامضہ ہیں کہ ان پر مطلع نہیں ہوتے، مگر توفیق والے۔

**اولاً:** جب معلوم ہو لیا کہ حق جل وعلا کی طرف اس کے محبوبوں سے توسل محمود و مقصود، و سنتِ ماثورہ و طریقۂ مامورہ، اور ہنگام توسل ان کی جانب توجہ درکار۔ یہاں تک کہ امام مالک سے خلیفہ ابو جعفر عباسی نے پوچھا: دعا میں قبلہ کی طرف منھ کروں، یا مزارِ مبارکِ حضورِ اقدس سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف؟ تو فرمایا: کیوں اپنا منھ ان سے پھیرتا ہے، جو قیامت کو تیرے اور تیرے باپ آدم علیہ السلام کے اللہ کی طرف وسیلہ ہیں۔ بلکہ انھیں کی طرف منھ کر، اور شفاعت مانگ کہ اللہ تعالیٰ تیری درخواست قبول فرمائے۔ اخرجہ الامام القاضی عیاض فی ''الشفا'' وغیرہ فی غیرہ۔ اور سوال حاجت سے پہلے دو رکعت نماز کی تقدیم مناسب کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ'' پھر کامل اکسیر یہ ہے کہ کسی محبوب خدا کے قریب جایئے۔ یا ان کی قبروں کی طرف چلیے۔ جیسے امام شافعی، سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کے مزار فائض الانوار کی طرف چلتے۔ اب یہ کہ گدائے سرکارِ قادریہ اس آستانِ فیض نشان سے دور و مہجور ہے، گو بعدِ نماز مزارِ اقدس تک جانے کی حقیقت اسے میسر نہیں۔ تاہم دل سے توجہ کرتا، اور چند قدم اس سمت چل کر ان چلنے والوں کی شکل بناتا ہے کہ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من تشبہ بقوم فھو منھم○

**ثانیاً:** توسل میں توجہ باطن ضرور، اور ظاہر، عنوان باطن، لہٰذا یہ چلنا مقرر ہوا کہ حالتِ قالب، حالتِ قلب پر شاہد ہو۔ جس طرح سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقا میں قلب ردا فرمایا کہ قلبِ لباس، قلبِ احوال و کشفِ یاس کی خبر دے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ''قول الجمیل'' میں قضائے حاجت کے لیے صلاۃ کن فیکون کی ترکیب لکھی۔ جس کے آخر میں ہے: ''پھر پگڑی اتارے، آستین گلے میں ڈالے، پچاس بار دعا کرے ضرور مستجاب ہو۔'' میں کہتا ہوں کہ جب آستین

گلے میں باندھنا، باآنکہ طرقِ ماثورہ میں وارد نہیں، اس وجہ سے کہ اس میں تضرع مخفی کا اظہارِ شدید ہے۔ اگرچہ نفسِ اظہار گڑگڑانے کی صورت سے حاصل تھا، جائز ٹھہرا۔ تو یہ چند قدم جانب عراقِ محترم چلنا، اس وجہ سے کہ اس میں توجہ مخفی کا اظہار قوی ہے، کیوں کر ناجائز ہوگا؟۔

**ثالثاً:** ظاہر، مصلحِ خاطر۔ ولہٰذا جس امر میں جمعِ عزیمت و صدقِ ارادت کا اہتمام چاہتے ہیں، وہاں اس کے مناسب افعال جوارح رکھے جاتے ہیں کہ ان کی مدد سے خاطر جمع اور انتشار دفع ہو۔ اس لیے نماز میں تلفظ بنیت بقصد جمع عزیمت، علمانے مستحسن رکھا اور یہ سر ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفع یدین، اور تشہد کے وقت انگشتِ شہادت سے اشارہ مقرر ہوا۔ بعینہٖ یہی حالت اس چلنے کی ہے کہ رغبتِ باطنی کی پوری تصویر بناتا، اور قلب کو انجذابِ تام پر متنبہ کرتا ہے۔ جیسا کہ اس علم شریف کے بجالانے والوں پر روشن۔ گو منکر محروم بخیر باش: ذوق ایں مئے نشناسی بخدا تا نچشی

**رابعاً:** سنتِ نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیہ ہے کہ جہاں انسان سے کوئی تقصیر واقع ہو، عملِ صالح وہاں سے ہٹ کر کرے۔ یہاں بھی یہ محتاج جب دو رکعت نماز پڑھ چکا، اور اب وہ وقت آیا کہ جہت توسل کی طرف منھ کر کے اللہ جل جلالہ سے دعا چاہتا ہے۔ نفس نماز میں جو قلت حضور وغیرہ قصور سرزد ہوئے، یاد آئے، اور سمجھا کہ یہ وہ جگہ ہے، جہاں شیطان کے دخل نے مجھ سے مناجاتِ الٰہی میں تقصیر کرادی، ناچار ہٹتا ہے اور پُر ظاہر کہ جہت توجہ اس کے لیے اولی وانسب۔ یمیناً وشمالاً انصراف میں ترک توجہ اور رجعت قہقری بعد کی صورت، اور اقبال، نشانِ اقبال۔ فکان ھو المختار۔

**خامساً:** خادمِ شرع جانتا ہے کہ صاحب شرع کو بابِ دعا میں تفاول پر بہت نظر ہے۔ اسی لیے استسقا میں قلبِ ردا فرمایا کہ تبدیل حال کی فال ہو۔ اسی لیے بدخوابی کے بعد جو اس کے دفع شر کی دعا تعلیم فرمائی، ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ کروٹ بدل لے، تاکہ اس حال کے بدل جانے پر فال ہو۔ اسی لیے ہنگام استسقا پشت دست جانب آسمان رکھے کہ ابر چھانے اور باراں آنے کی فال ہو۔ اسی لیے علمانے مستحب رکھا کہ جب دفع بلا کے لیے دعا ہو، پشتِ دست سوئے سما ہو۔ گویا ہاتھوں سے آتشِ فتنہ کو بجھاتا، اور جوشِ بلا کو دباتا ہے۔ اسی لیے دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنا مسنون ہوا کہ حصولِ مراد و قبولِ دعا کی فال ہو۔ گویا دونوں ہاتھ خیر وبرکت سے بھر گئے۔ اس نے وہ برکت اعلیٰ واشرف اعضا پر الٹ لی کہ اس کے توسط سے سب بدن کو پہونچ جائے گی۔

**سادساً:** صحیح مسلم میں بروایت جابر بن عبد اللہ مروی کہ سیدِ عالم ﷺ عین نماز میں چند قدم آگے بڑھے۔ جب جنت خدمتِ اقدس میں اتنی قریب حاضر کی گئی کہ دیوارِ قبلہ میں نظر آئی۔ یہاں تک کہ حضور بڑھے، تو اس کے خوشہ ہائے انگور دستِ اقدس کے قابو میں تھے۔ اور یہ نمازِ صلاۃ الکسوف تھی۔ اسی طرح جب اربابِ باطن واصحاب مشاہدہ یہ نماز پڑھ کر بروجہ توسل، عراق کی طرف توجہ کرتے ہیں، انوار وبرکات وفیوض وخیرات اس جانب مبارک سے باہزاراں جوش وہجوم پیہم آتے نظر آتے ہیں۔ یہ بے تابانہ ان خوشہ ہائے انگور جنات نور وباغات سرور کی طرف قدم شوق پر بڑھتے، اور ان عزیز مہمانوں کے لیے رسم باجمال تلقی واستقبال بجالاتے ہیں۔ سبحان اللہ! کیا جائے انکار ہے، اس نیک بندے پر جو اپنے رب کی برکات وخیرات کی طرف مسارعت کرے۔ رہے ہم عامی جن کا حصہ یہی شقشقۂ لسان واضطراب ارکان ہے، وبس۔ ہم اس امر جمیل میں ان اہلِ بصائر کے طفیلی ہیں۔

وللارض من کاس الکرام نصیب

جیسے نماز کے اس کے اکثر افعال واحکام ان اسرار وحکم پر مبنی جو حقیقۃً صرف احوالِ سینۂ اہل قلوب پر مبتنی۔ پھر عوام بھی صورت احکام میں ان کے مشارک۔

**سابعاً:** دیدۂ انصاف بے غبار وصاف ہو، تو احادیثِ صحیحہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جہاں جانا چاہے، اس طرف چند قدم قریب ہونا، اور جہاں سے جدائی مقصود ہو، اس سے کچھ گام دور ہونا بھی نافع بکار آمد ہوتا ہے، جب کمالِ قرب وبعد میسر نہ ہو۔ جب سید ناموسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کا زمانۂ انتقال قریب آیا، بن میں تشریف رکھتے تھے، اور ارضِ مقدسہ پر جبارین کا قبضہ تھا۔ وہاں تشریف لے جانا، میسر نہ ہوا۔ دعا فرمائی کہ اس پاک زمین سے مجھے ایک سنگ پرتاب قریب کردے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی کہ فسأل ان یدنیہ من الارض المقدسۃ رمیۃ بحجر۔ ظاہر ہے کہ

ہنگامِ حاجت سر دست عراق شریف کی حاضری متعذر۔ لہٰذا چند قدم اس ارضِ مقدسہ کی طرف چلنا ہی مقرر ہوا کہ مالا یدرك کلہ لایترك کلہ۔ رہی عدد یازدہ (۱۱) کی تخصیص۔ اس کی وجہ ظاہر۔ اللہ طاق ہے، اور طاق کو دوست رکھتا ہے۔ اور افضل الاوتار، واوّل الا تار ایک ہے۔ مگر یہاں تکثیر مطلوب، اور اس کے ساتھ تیسیر بھی ملحوظ۔ لہٰذا یہ عدد مختار ہوا کہ یہ افضل الاوتار کا پہلا ارتفاع ہے، جو خود بھی وتر، اور مشابہت زوج سے بھی بعید کہ سوا ایک کے اس کے لیے کوئی صحیح کسیر نہیں۔ اور اس سے ایک گھٹا دینے کے بعد بھی جوز وج حاصل ہوتا ہے، زوج محض ہے، نہ زوج الازواج۔ کہ اس کے دونوں حصص متساویہ خود افراد ہیں۔ بلکہ خلومرتبہ پر وہ بعینہٖ ایک ہے۔ بالجملہ اس نمازِ مقدس میں اصلاً کوئی محذورِ شرعی نہیں۔

اور حضراتِ منکرین کا یہ کہنا کہ صحابہ و تابعین سے منقول نہیں، صحابہ محبت و تعظیم میں ہم سے زیادہ تھے، ثواب ہوتا تو وہی کرتے؟

**اولاً:** وہی معمولی باتیں ہیں، جن کے جواب علمائے اہلِ سنّت کی طرف سے ہزار ہزار بار ہو چکے۔ جسے آفتابِ روشن پر اطلاع منظور ہو، ان کی تصانیفِ شریفہ کی طرف رجوع لائے۔ علی الخصوص کتابِ مستطاب "اصول الرشاد لقمع مبانی الفساد" وکتابِ لاجواب "اذاقة الآثام لمانعی عمل المولد والقیام" وغیرہما تصانیف تاجِ محققین سراج المدققین فخر الاکابر، وارث العلم کابرا عن کابر، سید ووالدی حضرت مولانا محمد نقی علی خاں صاحب اعظم اللہ اجرہ ونور قبرہ اور یہ فقیر غفر اللہ تعالیٰ علیہ بھی اس بحث اور اس کے امثال کو بروجہ اجمال رسالہ اقامۃ القیامۃ، ومنیر العین وغیرہما اپنے رسائل میں بقدر کفایت منقح کر چکا۔

**ثانیاً:** یہاں ان جہالات کا کوئی محل ہی نہیں۔ یہ نماز ایک عمل ہے کہ قضائے حاجات کے لیے کیا جاتا ہے۔ اور اعمالِ مشائخ میں تجدید واحداث کی ہمیشہ اجازت۔ شاہ ولی اللہ صاحب "ہوامع" میں لکھتے ہیں: "اجتہاد رادر اختراعِ اعمال تصریفیہ راہ کشادہ است مانند استخراج اطبا نسخہائے قرابادیں را۔" جامع ترسینے۔ شاہ ولی اللہ کتاب "الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں تصریح کرتے ہیں کہ انھوں نے "جواہرِ خمسہ" شیخ محمد غوث گوالیاری کی سندیں، اور اس کے اعمال کی اجازتیں، اپنے استادِ علمِ حدیث مولانا ابو طاہر مدنی، و شیخ محمد سعید لاہوری سے حاصل کیں۔ اور شیخ ابو طاہر نے اپنے والد ابراہیم کردی، انھوں نے شیخ احمد قشاشی، انھوں نے شیخ احمد شناوی، انھوں نے شیخ سید صبغۃ اللہ، انھوں نے شیخ وجیہ الدین گجراتی، انھوں نے شیخ محمد غوث گوالیاری سے حاصل کی۔ اسی طرح شیخ محمد سعید لاہوری نے شیخ محمد اشرف لاہوری، انھوں نے شیخ عبدالملک بایزید ثانی، انھوں نے شیخ وجیہ الدین گجراتی، انھوں نے شیخ محمد غوث گوالیاری سے حاصل کی۔

حضرات منکرین مہربانی کرکے "جواہر خمسہ" پر نظر ڈالیں، اور اس کے اعمال کا ثبوت قرونِ ثلاثہ سے دیں۔ بلکہ اپنے اصولِ مذہب پر ان اعمال کو بدعت و شرک ہی سے بچالیں، جن کے لیے شاہ ولی اللہ جیسے سنی، موحد محدث انہ سند لیتے، اور اپنے مشائخ حدیث وطریقت سے اجازت حاصل کرتے ہیں۔ زیادہ نہ سہی یہی دعائے سیفی جس کی نسبت شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا کہ میں نے اپنے شیخ سے اخذ کی، اور اجازت لی۔ اسی کی ترکیب میں ملاحظہ ہو کہ "جواہرِ خمسہ" میں کیا لکھا ہے:

"نادِ علی ہفت بار یا سہ بار یا یک بار بخواند وآں اینست:

نادعلیا مظهر العجائب تجده عونا لك فی النوائب

کل هم وغم سینجلی بولایتك یاعلی یاعلی یاعلی"

اسی طرح یہی شاہ ولی اللہ اسی رسالہ "انتباہ" میں قضائے حاجت کے لیے ختمِ خواجگانِ چشت کی ترکیب بتاتے ہیں، اور فرماتے ہیں: "دہ مرتبہ درود خواندہ ختم کنند و بر قدرے شیرینی فاتحہ بنام خواجگاں چشت عموماً بخوانند وحاجت از خدائے تعالیٰ سوال نمایند ہمیں طور ہر روز میخواندہ باشند انشاء اللہ تعالیٰ درایام متعددہ مقصود بحصول انجامد۔" مرزا مظہر جانِ جاناں صاحب اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں: "دعا حزب البحر وظیفہ صبح و شام وختم حضرات خواجگان قدس اللہ اسرار ہم ہر روز بجہت حل مشکلات باید خواند۔" دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں: "ختمِ خواجہا رضی اللہ تعالیٰ عنہم وختمِ حضرت مجدد رضی اللہ عنہ بعد حلقہ صبح لازم گیرید۔"

**ثالثاً:** خیر صلاۃ الاسرار شریف تو ایک عمل نظیف ہے کہ مبارک بندہ اپنے حصولِ اغراض ودفع اعراض کے لیے پڑھتا ہے۔ مزاج پرسی ان حضرات کی ہے، جو خاص امور ثواب و تقرب رب

الارباب میں، جو محض اسی نیت سے کیے جاتے ہیں، ہمیشہ تجدید واختراع کو جائز مانتے، اور ان محدثات کو ذریعۂ وصول الی اللہ جانتے ہیں۔ وہ کون؟ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، مرزا جان جاناں، شیخ مجدد الف ثانی، مولوی اسماعیل دہلوی، مولوی خرم علی بلہوری وغیرہم جنھیں منکرین بدعتی و گمراہ کہیں، تو کس کے ہو کے رہیں؟

شاہ ولی اللہ "قول الجمیل" میں اپنے اور اپنے پیرانِ مشائخ کے آدابِ طریقت واشغال ریاضت کی نسبت صاف لکھتے ہیں: "لم یثبت تعین الآداب ولا تلک الاشغال۔" شاہ عبدالعزیز صاحب "حاشیہ قول الجمیل" میں اس کی تائید فرماتے ہیں۔ مولوی خرم علی صاحب مصنفِ نصیحۃ المسلمین اسے نقل کر کے لکھتے ہیں: "یعنی ایسے امور کو خلاف شرع یا داخل بدعاتِ سیئہ نہ سمجھنا چاہیے، جیسا کہ بعض کم فہم سمجھتے ہیں۔" اور سنیے! اسی "القول الجمیل" میں اشغالِ مشائخ نقشبندیہ میں تصورِ شیخ کی ترکیب لکھی: "تیسرا طریقہ وصول الی اللہ کا رابطۂ شیخ ہے۔ جب شیخ کی صحبت میں ہو تو اپنا دل اس کی محبت کے سوا ہر چیز سے خالی کرے، اور فیض کا منتظر ہو۔ اور جب شیخ غائب ہو، تو اس کی صورت اپنے پیشِ نظر محبت و تعظیم کے ساتھ تصور کرے۔ جو فائدہ اس کی محبت دیتی تھی، اب یہ صورت دے گی۔" "شفاء العلیل" میں شاہ عبدالعزیز صاحب سے نقل کیا: "حق یہ ہے کہ سب راہوں سے یہ راہ زیادہ قریب ہے۔ اھ" اب کون کہے کہ یہ وہی راہ ہے، جسے آپ کے سچے معتقدین ٹھیٹ بت پرستی بتائیں گے۔ حد یہ کہ مولوی اسماعیل دہلوی نے بھی "صراط مستقیم" میں لکھا: "اشغال مناسبہ وقت وریاضات ملائمہ ہر قرن جدا جدا می باشند۔ ولہٰذا محققان ہر وقت از اکابر ہر طرق در تجدید اشغال کوششہا کردہ اند، بناء علیہ مصلحت دید۔ و وقت چناں اقتضا کرد کہ یک باب ازیں کتاب برائے بیان اشغال جدیدہ کہ مناسب ایں وقت است تجدید کردہ شود۔" اب خدا جانے یہ حضرات بدعتی کیوں نہ ہوئے؟ اور انھیں خاص ان امورِ دینیہ میں جو محض تقرب الی اللہ کے لیے کیے جاتے ہیں، نئی نئی باتیں جو قرآن وحدیث میں، نہ صحابہ میں، نہ تابعین میں، نکالنی اور عمل میں لانی، اور ان سے امید وصول الی اللہ رکھنی، کس نے جائز کی؟ سبحان اللہ! ان صاحبوں کے یہ احداث واختراع سب مقبول ہوں۔ اور ناجائز وبدعت ٹھہرے، تو وہ نماز جو حضورِ پرنور غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ نے قضائے حاجات کے لیے ارشاد فرمائی:

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

حق جل وعلا مسلمانوں کو نیک توفیق بخشے، اور اپنے محبوبوں کی جناب میں معاذ اللہ بدعقیدہ نہ کرے۔ خصوصاً حضور سید المحبوبین رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعنہم اجمعین۔ آمین! یہ ہے جو اس گدائے سرکارِ قادریہ پر برکات حضورِ پرنور غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ سے فائض ہوا:

گر قبول افتد زہے عزو شرف

گدائے بے نوا اپنے تاجدار عظیم الجود والعطا کے کرم بے علت سے، اس صلہ کا طالب کہ عفو وعافیت وحسنِ عاقبت کے ساتھ اس دارِ ناپائیدار سے رخصت ہوتے (وقت) حضورِ پرنور غوثِ اعظم وقطبِ عالم رضی اللہ عنہ کی محبت وعشق وعقیدت واتباع واطاعت پر جائے۔ اور جس دن یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ کا ظہور ہو، یہ سراپا گناہ، زیرِ لوائے بیکس پناہ سرکارِ قادریت جگہ پائے۔ فان ذالك علی اللہ یسیر ان اللہ علی کل شئی قدیر۔ بحمد اللہ وقع الفراغ من تسویدہ لثمان خلون للقمر الزاهر من شهر ربیع الآخر فی ثلثة مجالس من ثلاث عدوات عام الف وثلث مأئة وخمس من هجرة سید الکائنات علیه وعلی آله وابنه افضل الصلوات۔ آمین!

ادارے کے معاونین سہروردی صاحبان کے والد محترم قضائے الٰہی سے انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی گذارش ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ اگلے شمارے میں پیش ہو گی۔

ادارے کے سربراہ صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری مدظلہ العالی دل کے آپریشن کے بعد ابھی تک علیل ہیں قارئین سے دعائے صحت کی گذارش ہے۔ ادارہ اندرونِ ملک کے ان تمام علماو مشائخ اور محققین و اسکالرز کا شکر گزار ہے جنھوں نے بذریعہ فون، خط یا ای میل ان کی خیریت دریافت کی اور اپنی دعاؤں کا اظہار کیا۔

# اصولِ حدیث اور اصولِ دعوت وتبلیغ

## ''تقریروں میں موضوع روایات ایک لمحہ فکریہ''

مشتاق احمد مصباحی (پرنسپل دارالعلوم رضویہ، چکیا، مشرقی چمپارن)

بڑا مبارک ہے وہ جملہ جو دل کی دنیا میں صحت مند انقلاب برپا کر دے، اگرچہ اس کی سند پورے ذخیرۂ حدیث میں نہ ملے۔ قبل اس کے کہ اس کو مثال سے واضح کریں فی الحال ''ماہنامہ جام نور'' کے ایک مضمون پر ہم حضرت شاہ ولی اللہ کی اس بات سے تبصرہ شروع کرتے ہیں کہ: ''علم انشراح صدر کا نام ہے، نہ کہ اصولیین کے وضع کردہ اصولوں کی تقلیدِ جامد کا۔'' (حجۃ اللہ البالغہ)

''ماہنامہ جام نور'' کے اکتوبر اور نومبر 2010ء کے شمارے میں فاضل محقق جناب مولانا اسید الحق صاحب کا مضمون ''تقریروں میں موضوع روایات ایک لمحہ فکریہ'' نظر سے گزرا۔ مضمون بڑا دلچسپ ہونے کے ساتھ بڑا دل خراش لگا اور کچھ حاملِ تضادات بھی۔ مواد کے اعتبار سے موجودہ دور میں جو عام مقررین کا حال ہے اس میں سدھار آنا ہی چاہیے۔ لیکن اس کے لیے جو بات کہی جائے اسے دعوت و حکمت کے انداز میں پیش کرنا ضروری ہے نہ کہ بڑوں بڑوں پر جارحانہ ریمارکس دے کر، مضحکہ خیزی اور ہوا خیزی کر کے۔ اس طرح بات بننے کے بجائے بگڑ جاتی ہے۔ اس تحقیقی مضمون کے کچھ مواد اور طرزِ بیان پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ضرر اس کے نفع سے زائد ہے۔

مضمون میں جابجا تمسخر اور استہزا کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ بلکہ کہیں کہیں انداز جارحانہ ہو گیا ہے۔ پھر اختتام پر یہ ارشاد ہوا کہ یہ تحریر نصح و خیر خواہی کے جذبے سے لکھی گئی ہے۔ جو تحریر نصح و خیر خواہی کے جذبے سے لکھی گئی ہو گی اس قدر جارحانہ نہیں ہو سکتی جس میں اس طرح کے ایرادات کیے گئے ہوں: ''☆موصوف ہمارے ایک مرکزی جامعہ سے تازہ تازہ فارغ ہوئے تھے۔'' ☆''میں اس روایت کی تلاش کی بجائے اب کسی خانقاہ میں اس غیبی سیب کی تلاش میں ہوں تا کہ دنیا ہی میں جنتی پھل کا نظارہ کر سکوں'' ☆''حضرت اسماعیل حقی کچھ بھی ہوں بہر حال از اوّل تا آخر ایک صوفی ہیں۔'' ☆''میں نے آج تک ''روح البیان'' میں اس روایت کو تلاش نہیں کیا، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز روایتیں ''روح البیان'' میں ہو سکتی ہیں۔'' ☆ ''صوفیا کے ملفوظات محدثانہ نقطۂ نظر سے جیسے کچھ ہیں وہ اہلِ علم خوب جانتے ہیں۔''

اپنی تنقید میں موصوف نے کن کن علما کا شکار کیا ہے ان کی طرف درج ذیل القاب سے اشارے کیے گئے ہیں: ''☆ جماعت کی ایک انتہائی قابلِ احترام شخصیت۔'' ☆ ''ایک بہت بڑے بزرگ نے۔'' ☆ ''ایک بین الاقوامی خطیب۔'' ☆''ہمارے زمانے کے ایک شارح بخاری۔'' ☆''اپنے زمانے کے ایک مشہور علامہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ خطاب فرما رہے ہیں۔'' ☆''محرم کے خطبات کے سلسلے میں ایک بڑے سنی عالم کی کتاب''۔ (جام نور: اکتوبر، نومبر ۲۰۱۰ء)

اس طرح کے جملوں سے کیا بتانا مقصود ہے؟ کس کس پر وار کیا گیا۔ اگر واقعۃً کسی بڑے عالم نے کبھی کسی تقریر میں کوئی بے اصل روایت بیان کر دی تو ''لکل جواد کبوۃ'' کی پردہ داری کی جا سکتی ہے۔ اور وہ عالم ہمیشہ بے بنیاد باتیں ہی بیان کرتے رہتے ہوں تو انھیں بڑا عالم کہنا صریح استہزا مانا جائے گا۔

### حکم وضع کے لیے دلیل چاہیے!

مشہور روایت ''لی مع اللہ وقت'' کو بے حوالہ درج کرنے پر تنقید نگار لکھتے ہیں: ''ہمارے زمانے کے ایک شارح بخاری نے اپنی شرح بخاری میں ایک مقام پر یہ روایت نقل کی ہے، مگر انھوں نے بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا''۔ (جام نور، ص۱۳، نومبر ۲۰۱۰ء) اس پر عرض ہے کہ موصوف کے مذکورہ مقالے میں مجموعی طور پر ایسی ۲۳ روایتیں پیش کی گئی ہیں جن کے موضوع ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔

لیکن قارئین کو حیرت ہوگی کہ ان میں ۱۳/ روایتیں ایسی ہیں جن کے موضوع ہونے کا محض دعویٰ کیا گیا، اور کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔بس اس قسم کے جملوں پر اکتفا کیا گیا: "☆ میرا گمان یہ ہے کہ حدیث ہندوستان ہی میں وضع کی گئی ہے، کسی کتاب میں شاید نہ دکھائی جاسکے۔"☆"یہ حدیث بالکل موضوع ہے کتابوں میں اس کا کوئی اتا پتا نہیں۔"☆"یہ روایت مجھے آج تک کسی کتاب میں نہیں ملی۔" ☆"اس روایت کو پچھلے چار پانچ سال سے تلاش کر رہا ہوں لیکن ان کی تقریر کے علاوہ آج تک کہیں نظر نہیں آئی۔"☆"یہ میرے لیے بالکل نئی روایت ہے۔"☆"گمان غالب یہ ہے کہ یہ بھی ان شیعی روایتوں میں سے ہے جو حضرت علی کے فضائل میں وضع کی گئی ہیں۔" ☆"ہمارے خیال میں یہ روایت بھی میڈ ان انڈیا کے قبیل سے ہے۔"☆"ہزار تلاش کے باوجود بھی یہ روایت مجھے کسی معتبر کتاب میں نہیں ملی، گمان غالب ہے کہ یہ بھی موضوع روایتوں میں سے ہے۔"☆"یہ روایت علامہ جامی کی "نفحات الانس" جیسی کتاب میں ہو تو ہو لیکن تابعین کے حالات پر لکھی جانے والی کسی معتبر کتاب میں تلاش بسیار کے باوجود ہمیں نہیں ملی۔" ☆"یہ حدیث بھی ہمیں آج تک نہیں ملی"۔ (جام نور، اکتوبر ونومبر ۲۰۱۰ء مذکورہ مضمون)

اصولِ حدیث کی کتابوں میں محدثین نے وضع کی جو دس علامتیں ذکر کی ہیں ان میں یہ ایک نئی قسم کا اضافہ ہے کہ جس روایت کو چند کتابوں میں نہ پاؤ اسے بھی موضوع کہہ دو۔ اس مقام پر مناسب ہے کہ اصولِ حدیث کی مشہور کتاب "فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث" سے امام سخاوی کا ایک اقتباس نقل کر دیں۔ امام سخاوی فرماتے ہیں:

"ولذا كان الحكم من المتأخرين عسير جداً وللنظر فيه مجال بخلاف الائمة المتقدمين الذين منحهم الله التبحر في علم الحديث والتوسع في حفظه كشعبة والقطان وابن مهدي ونحوهم و أصحابهم مثل أحمد وابن المديني وابن معين وابن راهويه وطائفة، ثم أصحابهم مثل البخاري ومسلم وأبي داود والترمذي والنسائي، وهكذا الى زمن الدارقطني والبيهقي، ولم يجي بعدهم مساوٍ لهم ولا مقارب، أفاده العلائي، وقال: فمتى وجدنا في كلام أحد من المتقدمين الحكم به كان معتمداً لما أعطاهم الله من الحفظ الغزير۔" (فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث ا/ ۲۵۵) ترجمہ: اسی لیے متاخرین کا حکم وضع لگانا بہت مشکل ہے اور لگادیں تو وہ محل نظر ہے۔ برخلاف اس کے ائمہ متقدمین جنھیں اللہ تعالیٰ نے علم حدیث میں تبحر عطا فرمایا اور بڑا وسیع حافظ دیا جیسے شعبہ، یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مہدی وغیرہ اور ان کے تلامذہ مثلاً امام بخاری و مسلم و ابوداود و ترمذی ونسائی، اسی طرح امام دار قطنی اور امام بیہقی تک۔ لیکن ان کے بعد ان کے ہم پلہ کوئی نہ پیدا ہوا۔ یہ علامہ علائی کا افادہ ہے۔ فرماتے ہیں: جب ہم متقدمین میں سے کسی کے کلام میں پائیں گے کہ انھوں نے (کسی روایت پر) وضع کا حکم لگایا ہے تو اس پر اعتماد کیا جائے گا کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں زبردست حافظ دیا ہے۔ اتنا عرض کر دوں کہ امام سخاوی نے یہ عبارت علامہ ابن جوزی کی "موضوعات" سے متاثر ہو کر درج فرمائی۔ علامہ ابن جوزی نے بہت ساری حدیثوں پر اپنی سمجھ اور اندازوں سے موضوع ہونے کا حکم لگادیا، اور کسی امام کے قول کا حوالہ نہ دیا، جس پر شدید گرفت ہوئی۔ اس پر حافظ ابن صلاح، حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام سیوطی نے سخت ایرادات کیے، تعقبات لکھے گئے۔ امام سخاوی نے فرمایا کہ اپنے طور پر انھوں نے جو وضع کا فیصلہ کیا وہ قابل اعتماد نہیں۔ خواہ وہ کسی کذاب اور وضاع کا تفرد ہی سمجھ کر انھوں نے یہ حکم لگایا ہو۔ مانا کہ "شارح بخاری" نے ایک روایت ذکر کر دی اور شہرت کی بنا پر اس کا حوالہ نہ دیا۔ لیکن موصوف نے وہ روایت جس میں حضرت جبریل امین اپنی عمر کے بارے میں ستر ہزار برس پر طلوع ہونے والے ستارے کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس کو بے حوالہ موضوع کیسے لکھ دیا گیا؟ تنقید میں تو الزام دینا ہوتا ہے۔ لہٰذا تنقید کی بنیاد اور زیادہ ٹھوس ہونی چاہیے۔ کیا یہ بتانا ضروری نہ تھا کہ کس محدث نے یا کس امام نے اسے موضوع کہا ہے؟۔ موضوعات پر لکھی گئی کتابوں میں سے کس کتاب میں اس کا ذکر ہے؟ کون سے کلماتِ جرح اس کے بارے میں وارد ہوئے ہیں؟۔ یا فقط اس لیے موضوع ہے کہ آپ کے مطالعہ میں نہ آئی۔

جو باتیں حضور اقدس ﷺ کی طرف منسوب ہیں ان میں عدمِ وضع اصل ہے۔ جو وضع کا دعویٰ کرے اس کی ذمہ داری ہے کہ کوئی علامت وضع دکھلائے، یا کسی امام کا قول نقل کرے۔ اپنی نہ ہانکے۔ امام سخاوی فرماتے ہیں:

"مجرد تفرد الكذاب بل الوضاع ولو كان بعد الا ستقصاء

فی التفتیش من حافظ متبحر تام، فان الا ستقراء غیر مستلزم لذلك، بل لا بد معه من انضمام شئی مماسیاتی۔" (بحوالہ الہاد الکاف، ص۱۷) ترجمہ: محض کسی کذاب یا وضّاع کے تفرد کی بنا پر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا، اگرچہ کوئی کامل متبحر، حافظ الحدیث بھر پور تفتیش کے بعد (اس نتیجہ پر پہنچا ہو پھر بھی وضع کا حکم نہیں لگایا جاسکتا) بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور امور کا اعتبار ضروری ہے۔

وہ کون سے امور ہیں جن کا اعتبار ضروری ہے، مثلاً یہ کہ وہ قرآن و حدیث یا اجماع کی قطعیت کے منافی ہو، بداہتِ عقل کے مخالف ہو، تاریخی اعتبار سے ممکن نہ ہو۔ اس کے الفاظ اس قدر گھٹیا ہوں جن کا زبان فصیح اللسان علیہ السلام سے نکلنا مستبعد ہو، وغیرہ۔ آخر ابن قتیبہ دینوری کی تصنیف "تاویل مختلف الاحادیث" جس سے موصوف نے استناد کیا ہے، اس میں بھی تو مصنف نے منکرین حدیث کے جواب میں ضعاف اور منکر روایات سے استدلال کیا ہے، بلکہ اس میں موضوع روایتیں بھی موجود ہیں۔ اور موصوف مقالہ نگار نے اسی کتاب سے ایک عبارت اپنے استدلال میں نقل کر دی۔ (جام نور، اکتوبر، ص۱۳) اب موصوف کے اس استدلال کا کتنا اعتبار کیا جائے؟

مقالہ نگار کے نزدیک کاشفی کی ""معارج النبوۃ"، علامہ جامی کی "نفحات الانس"، اور "تفسیر روح البیان" غیر معتبر ٹھہری، اس طرح تو بہت ساری متداول کتابوں پر عام قاری کا اعتماد متزلزل ہو جائے گا کہ ہو سکتا ہے ان کا بھی حال یہی ہو۔ پھر اگر انھیں پتہ چلے کہ بخاری و مسلم تک ضعاف اور مناکیر سے خالی نہیں تو پھر عام قارئین کیا نتیجہ اخذ کریں گے۔ دراصل جس کتاب میں چند ضعیف یا منکر روایتیں در آئیں لیکن اکثر صحیح اور ثابت روایتیں ہوں تو وہ معتبر قرار پاتی ہے۔ کسی کتاب کے معتبر ہونے کے لیے اگر یہ ضروری ہو کہ اس میں موجود کسی روایت پر ناقدین نے کلام نہ کیا ہو تو روئے زمین پر ایسی کوئی کتاب انسانوں کی لکھی ہوئی موجود نہیں ہے۔ عموماً کتبِ تفسیر میں اسرائیلی روایات موجود ہیں۔ اس میں تفسیر روح البیان کی تخصیص نہیں، بلکہ تفسیر مدارک التنزیل، تفسیر بیضاوی، تفسیر رازی، تفسیر طبری، تفسیر سعدی، وغیرہ میں بھی منکر روایات ہیں، تفسیر ابن عباس کی سند کو امام سیوطی نے سلسلۃ الکذب کہا، پھر خود بھی تفسیر در منثور میں اسی سند سے متعدد روایتیں نقل کر دیں۔ اب یا تو تفسیر کا دروازہ بند کر دیا جائے، یا پھر کوئی ایسی تفسیر کی کتاب ڈھونڈ کر لائی جائے جس میں اسرائیلیات، یا منکر روایات نام کو نہ ہوں۔

یہ ایک اہم سوال ہے کہ اگر کوئی روایت زبان زد ہو اور کتب حدیث میں اس کا نشان نہ ملے تو کیا اسے موضوع قرار دیا جائے گا؟ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ وہ روایت حدیث ہوتی تو کہیں تو ذکر ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر متقدمین میں سے کسی امام نے وضع کی صراحت نہ کی ہو تو محض اپنے مطالعہ کی بنیاد پر اس دور میں کون کہہ سکتا ہے یہ روایت کسی کتاب میں نہیں۔ اس جبروتی حکم کے لیے کتب اسلامی کے پورے ذخیرے کا احاطہ چاہیے، جو عادۃً ممکن نہیں۔ امام سخاوی کے مذکورہ حوالے سے یہ ثابت ہوا کہ متاخرین کو یہ حق نہیں کہ وہ اس بنیاد پر حکم وضع لگائیں۔ آیئے اس موضوع پر کچھ تفصیلی گفتگو سے پہلے موصوف مقالہ نگار کا دعویٰ ملاحظہ کرتے ہیں: فاضل مقالہ نگار فرماتے ہیں: "اگر کوئی صاحب علم حدیث میں اپنی قابلیت کا ثبوت یہ کہہ کر دینا چاہیں کہ "لم اجدہ" کا مطلب حدیث کا موضوع ہونا نہیں ہوتا، تو ان سے ادباً التماس ہے کہ اصولِ حدیث کی یہ ساری نزاکتیں اس کم ترین راقم الحروف کے بھی پیش نظر ہیں"۔ (جام نور اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص۱۷) اس آخری جملے سے نہ معلوم بحث و نظر کا دروازہ بند کر دینا مقصود ہے یا اپنے موقف کو حرف آخر قرار دینا منظور ہے۔ مقصد جو بھی ہو لیکن اس پر عرض ہے کہ آپ کا "لم اجد" اگر ساری دنیا سے نرالا نہیں تو بتائیں کہ احیاء العلوم میں درج شدہ حدیثوں کی تخریج علامہ زین الدین عراقی نے کی اور اس میں جو روایتیں ان کو کہیں نہ ملیں صاف لکھ دیا "لم اجدہ"۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ انھوں نے ان احادیث کو موضوع قرار دے دیا؟۔ اسلاف کی بہت کتابوں میں حدیث درج کی ہوتی ہے اور تخریج کرنے والے کو نہیں ملتی۔ خود فقہ حنفی کی معتمد کتاب ہدایہ کی بعض حدیثوں کے بارے میں تخریج کرنے والوں نے کہا "لم اقف علیہ"۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ اسلاف کی کتابوں میں کوئی حدیث کسی خاص کتاب کے حوالے سے مذکور ہو، اور ماہرین نے جب اسی محولہ کتاب میں اس حدیث کی تفتیش کی اور وہ روایت اس میں نہ ملی، تو فوراً اس پر وہ جبروتی حکم نہ لگا دیا۔ بلکہ اس کو نسخوں کی تعداد اور اختلاف پر محمول کیا۔ ماہرین تخریج بھی "لم اجدہ" اور "موضوع" میں فرق کرتے ہیں اور دونوں کو ایک

دوسرے کا مرادف نہیں قرار دیتے۔ جب "لم اجده" کہتے ہیں تو اس پر حکم وضع نہیں لگاتے۔ اور جب "موضوع" کہتے ہیں تو اس کی دلیل دیتے ہیں کہ کس محدث یا کس امام جرح وتعدیل نے اسے موضوع قرار دیا۔ لیکن خدا جانے یہ کون سی بلائے آسمانی ہے کہ جو حدیث نہ ملی اسے موضوع قرار دے دیا جائے۔ تھوڑا احتیاط کیا تو کہہ دیا "ہمارے خیال میں موضوع ہے۔ غالب گمان ہے کہ موضوع ہے" مزید احتیاط کیا تو لکھ دیا کہ کوئی ثابت کر دے تو ہم قبول کر لیں گے۔ حالانکہ اس دور میں ہر عالم بلکہ محدث پر لازم ہے کہ وضع حدیث کا قول اسی وقت کرے جب کہ کسی امام الحدیث کا قول اسے معلوم ہو، اور حوالے کے ساتھ کرے۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے لیے تو حوالہ دینا ضروری ہو اور خود بغیر حوالے کے وضع کے دعوے کرتا جائے۔

علامہ طاہر فتنی اپنی "موضوعات" کے مقدمے میں فرماتے ہیں:

"اعلم ان الخبر ثلاثة اقسام: قسم یجب تصدیقه وهو مانص الائمة علی صحته، وقسم یجب تکذیبه وهو مانصوا علی وضعه، وقسم یجب التوقف فیه لاحتماله الصدق والکذب کسائر الاخبار"۔ (تذکرة الموضوعات للصغانی، ص ۳) ترجمہ: روایتیں تین قسموں پر ہیں، وہ روایت جس کی تصدیق ضروری ہے۔ یہ وہ روایت ہے جس کی صحت کی ائمہ حدیث نے تصریح کی ہے۔ دوسری قسم وہ روایت ہے جس کی تکذیب ضروری ہے، یہ وہ روایت ہے جس کے وضع کی ائمہ حدیث نے صراحت کی ہے۔ تیسری قسم وہ روایت ہے جس کے بارے میں توقف ضروری ہے، کیوں کہ وہ صدق وکذب دونوں کا احتمال رکھتی ہے، جیسے دیگر تمام روایتیں۔ درحقیقت کسی روایت کو موضوع قرار دینے کے لیے وہ روایت عقلاً یا شرعاً محال نہ ہوتی کسی امام کی تصریح ضروری ہے۔ ورنہ اسے موضوع نہیں قرار دیا جاسکتا۔ رہا اپنا خیال اور گمان، تو اس میدان میں اٹکل اور گمان کے گھوڑے دوڑانا سخت بدگمانی ہے۔ بعض ماہرین کے نزدیک حدیث کی ساڑھے تین سو کتابیں ہیں، جن کے بارے میں یقین ہے کہ اس دور کا کوئی ماہر ان کا نام بھی شمار نہیں کر سکتا۔ کجا یہ کہ تمام روایتوں پر حاوی ہو چکا ہو۔ ہم نے متاخرین میں سے کسی ماہر حدیث کو نہ دیکھا کہ اپنے نہ پانے کی بنا پر موضوع قرار دیا ہو۔ بڑے بڑے ماہرین حدیث جب کسی کتاب کی تخریج کرتے ہیں تو جو روایت انھیں نہیں ملتی صاف لکھتے ہیں: "لم اجده، لم اقف علیه"۔ اور آگے بڑھ جاتے ہیں، نہ کہ ساتھ ہی ساتھ حکم وضع لگاتے جائیں۔

کسی روایت کو تلاش کرنے کے باوجود نہ پانے کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔ جن میں بہت واضح سبب یہ ہے کہ کسی روایت کو جس کتاب میں، جس باب میں ہونا چاہیے وہاں تلاش کیا، نہ ملی تو سمجھ بیٹھیں کہ یہ حدیث اس کتاب میں نہیں۔ حالانکہ وہ اسی کتاب میں کسی اور مقام پر ہو سکتی ہے۔ مثلاً "صحیح بخاری" کی کوئی روایت جس موضوع سے تعلق رکھتی ہے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس باب کے بجائے کسی ایسے مقام پر ہوتی ہیں جہاں وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ امام بخاری نے حدیث "نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن عسب الفحل" جسے امام بخاری نے کتاب الاجارة میں ذکر کیا۔ امام حاکم نے "مستدرک" میں اسے اسی سند سے ذکر کیا، پھر فرمایا: "یہ حدیث بخاری کی شرط پر ہے لیکن شیخین نے تخریج نہ کیا"۔ حالانکہ یہ حدیث "بخاری شریف" "کتاب الاجارة میں موجود ہے۔ حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" میں فرمایا کہ حاکم نے اسے کتاب البیوع میں نہ دیکھا تو سمجھا کہ یہ صحیح بخاری میں نہیں۔ ایسی بہت سی روایتوں کی امام حاکم نے "مستدرک" میں تخریج کر دی اور فرمایا کہ حدیث بخاری میں نہیں۔ حالانکہ وہ بخاری میں کسی دوسرے مقام پر موجود تھی۔ اسی لیے علمائے اعلام نے فرمایا کہ اس میدان میں عدم وجدان عدم وجود کی علامت نہیں۔ فاضل مقالہ نگار کے نزدیک: تابعین کے حالات پر لکھے جانے والے چند صفحات میں حضرت اویس قرنی کا کوئی خاص واقعہ ذکر نہ ہو تو یہ بھی فاضل مقالہ نگار کے نزدیک علامت وضع ہوگئی۔ حالانکہ ہر عقل مند جانتا ہے کہ اس کائنات میں حضورِ اقدس ﷺ کے علاوہ کسی کی پوری زندگی کے واقعات وحالات کا احاطہ کرنے کی جدوجہد نہیں کی گئی ہے۔ نہ اس کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ اسی لیے دیگر حضرات کے حالات میں اتنی تفصیل نہیں ملتی جو ان کے سارے احوال کو محیط ہو۔ مثلاً حضرت اویس قرنی کا ذکر کسی نے چار صفحوں میں کیا کسی نے پانچ صفحوں میں، تو کیا آپ کے احوال اتنے ہی صفحات تک محدود ہیں؟ واللہ! بہت ساری باتیں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہیں اور قطعاً حقیقی ہوتی ہیں۔ تاریخ یا رجال پر لکھنے والا اس واقعے میں کوئی ایسا پہلو تھا جس کی بنا پر اس نے ذکر کرنا مناسب نہ

سمجھا۔ یا ان کا ذکر اس کے موضوع کا حصہ نہ تھا اور جتنا ذکر کر دیا اسی پر اکتفا کرنا چاہا وغیرہ ہزاروں اسباب ہیں۔ لیکن جب سلاسل صوفیا میں کوئی بات مشہور ہے اور کتب روایات میں اس کا ذکر نہ ملے تو اب سوال یہ ہے کہ اسے کیا قرار دیا جائے؟ ایسی صورت میں اسے موضوع یا باطل نہ سمجھنا چاہیے۔ اور اس بات سے کسی کو الزام نہ دینا ہو بلکہ تلقین و تحریض مقصود ہو تو بیان کرنے میں حرج نہیں۔

یہ بڑی خطا ہے کہ بات جس میدان سے تعلق رکھتی ہے اسے کسی اور فن کے اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کی جائے۔ محدثین نے اصولِ حدیث تو اس لیے وضع کیا تاکہ جو بات کلام رسول کی حیثیت سے سامنے آئے وہ اس قدر پختہ ہو کہ شرعی قانون کا ماخذ بن سکے۔ لیکن فقہا نے محدثین کے اصول کو اپنے لیے کافی نہ سمجھا، بلکہ فقہ و فتاوٰی کے خود اپنے اصول تیار کیے۔ اصولِ فقہ پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ جن کے مطابق بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو روایت محدثین کے نزدیک معتبر نہیں وہ فقہا کے نزدیک معتبر ہیں اور جو ان کے نزدیک معتبر ہے وہ فقہا کے نزدیک معتبر نہیں۔ یہی حال سلوک و تصوف کا ہے۔ اس کا اپنا معیار ہے۔ لہٰذا کتب تصوف کی کوئی روایت کتب تصوف کی ہی روایت رہے گی۔ اسے کتب حدیث کی روایت نہیں قرار دینا چاہیے۔ صوفیا اسے سند کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ نہ وہاں الفاظِ تحدیث و اخبار کا کوئی رواج ہے۔ لہٰذا انھیں اصولِ حدیث پر پرکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ فلاں کتاب میں درج ہے۔ نہ یہ کہ اس کو یوں پرکھا جائے کہ صحیح ہے یا حسن؟ یا ضعیف؟ ہے تو ضعف خفیف ہے یا شدید؟ منکر ہے یا معلل؟ کیوں کہ تصوف میں ان حدیثوں کو پیش کرنے کا مقصد تحریض و تلقین ہے اور اس کے لیے اس قدر نزاکتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر صوفیائے کرام کے لیے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ وہ کسی حدیث کو اسی وقت پیش کریں جب اسے اصول حدیث کی رو سے خوب پرکھ لیں تو کسی صوفی بزرگ نے آج تک کوئی حدیث بیان کی ہی نہ ہوتی۔ انھیں تو جس بات پر اطمنان خاطر ہو جاتا ہے کہ یہ حضور اقدس ﷺ کا قول ہے اسے برملا بیان کرتے ہیں، چاہے اب ماہرین حدیث کو وہ قول ملے نہ ملے۔ چاہے وہ اس کی سند ہی تلاش کرتے پھریں۔ لہٰذا جب کوئی قولِ رسول کسی مستند بزرگ کی تصنیف میں یا ملفوظات میں جسے احتیاط سے ترتیب دیا گیا ہو مل جائے تو اسے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ خواہ تقریر میں ذکر کی جائے کوئی حرج نہیں۔ بلکہ صوفیا اور بزرگوں پر اعتماد کرتے ہوئے ذکر کرنا ہی چاہیے۔ اور لکیر کا فقیر بنے رہنے اور ہر بات میں شک میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر علمِ حدیث یا روایات حدیث پر کوئی کتاب ترتیب دے رہے ہیں تو اب صوفیا کے حوالے سے فن حدیث کی اس کتاب میں درج کرنے کی بجائے علم حدیث کی ہی کتب کا حوالہ دینا چاہیے۔

اگر فرق مراتب نہ کنی۔۔۔

ایسا بسا اوقات ہوتا ہے کہ آدمی جب حالت جدل و مناظرہ میں ہوتا ہے تو اپنی بات مسلمہ حوالوں سے ہی پیش کرتا ہے، جس میں کوئی حرف رکھنے کی جگہ نہ ہو، لیکن جب حلقۂ یاراں میں ہوتا ہے تو اپنی گفتگو میں صحاح کے ساتھ حسان اور ضعاف بھی لاتا ہے، اپنے ممدوح کی حمایت میں کم سے کم درجے کی بات بھی بیان کرنے سے احتراز نہیں کرتا۔ یہی بات خطبا اور مقررین کے حق میں کہی جاسکتی ہے۔ وہ اسٹیج پر جب کھڑے ہوتے ہیں تو انھیں شرعی قوانین کی دفعات نہیں سنانی ہوتیں، نہ اسٹیج پر کئی خطیب، مفتی یا قاضی بن کر نہیں پہنچتا، بلکہ اسٹیج پر پہنچنے کے بعد وہ ایک مقرر اور داعی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس دورِ صحافت میں یہ بات بار بار آچکی ہے کہ تقریر و خطابت دراصل دعوت و تبلیغ کا ایک ذریعہ ہے، نہ کہ شرعی دفعات کا محل۔ اس لیے تمام تر مفہوم میں اس کے انداز اور مواد میں ترغیبی پہلو نمایاں ہونا چاہیے۔ اہلِ علم خطیبوں کے ساتھ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ مجمع اپنے ہی لوگوں کا ہے جو ہم فکر و ہم خیال ہیں تو اپنی بات کو مناظرانہ انداز میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے؛ بلکہ فہمائش کا انداز اختیار کرتے ہیں اور اس کے لیے ضعاف کو پیش کرنے میں حرج نہیں؛ بلکہ ایسی روایتیں پیش کرنے میں بھی حرج نہیں جو لوگوں میں مشہور ہوں اگرچہ ان کی کوئی سند نہ ہو۔ ہاں اس قدر احتیاط کرنا چاہیے کہ اسے قولِ رسول نہ کہا جائے بلکہ علامہ صغانی نے موضوع روایتوں کے بارے میں بھی یہی مشورہ دیا ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ اسی مقام کے لیے خود علمائے اصولِ حدیث نے لکھا کہ جب ہم فضائل کے باب میں ہوتے ہیں تو سندوں کی کچھ پروا نہیں کرتے۔

تقریروں کے حوالے سے مناسب نظریہ: سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مقرر عالمِ دین ہو، جو عقائدِ حقہ کی وضاحت کی قدرت رکھتا ہو اور ضروری مسائل سے آگاہ ہو۔ اس کے بعد تقریروں میں اہمیت اس بات کی نہیں کہ جو روایت پیش کی جارہی ہے وہ کس درجے کی ہے؟ اصولِ حدیث کی رو سے اس کی پوزیشن کیاہے؟ بلکہ تقریر کے لیے اہم یہ ہے کہ وقت اور حالات کے لحاظ سے تقریر کا موضوع کیا اختیار کیا گیا ہے؟ اور پیش کیے گئے مواداس موضوع کو کس قدر سپورٹ کررہے ہیں؟ یہ مواد نصوصِ قرآنی سے لے کر، احادیثِ رسول یا اقوالِ علما و احوالِ اسلاف، ارشاداتِ صوفیا، دانشورانِ زمانہ کے نظریات، یاواقعات وحادثات، یا اپنے ذاتی تجربات، جذباتی جملے، یالطائف وظرائف، حتیٰ کہ تقریبِ فہم کے لیے بناوٹی تمثیلات بھی ہوسکتی ہیں۔

علامہ طاہر فتنی تذکرۃ الموضوعات میں فرماتے ہیں: قال الصغانی اذاعلم حدیثاً متروك أو موضوع فلیر وه ولکن لا یقول علیه قال رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (تذکرۃ الموضوعات، ص۴) ہاں اتنی احتیاط ضروری ہے کہ جو بات جہاں سے اخذ کریں اس کا حوالہ دیدیں۔ اتنا کردینے سے ان علما کی صف میں تو آہی جائیں گے جو اپنی کتابوں میں تمام روایتیں جمع کردیتے ہیں اور سند ذکر کرکے اپنا کام پورا کردیتے ہیں۔ ردو قبول قارئین کا کام ہے۔ خطباتِ محرم میں مؤلف نے اپنے موضوع پر جو واقعات پیش کیے ہیں ان کو جہاں جہاں سے اخذ کیا ہے اس کا حوالہ دے دیا ہے اور ان واقعات کے تعلق سے صحت یا عدمِ صحت کا اپنا کوئی موقف ظاہر نہیں کیا۔ تو اسے اس درجے کی کتاب قرار دیا جاسکتا ہے جس میں صرف حوالوں کے ساتھ نقلِ روایات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور ردو قبول کا فیصلہ قارئین کے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حدیث کی بہت سی کتابیں اسی درجے کی ہیں۔ ورنہ حدیث کی سیکڑوں کتابوں میں صحیح احادیث کا التزام کتنے محدثین نے کیا؟ بس بخاری و مسلم نے۔ وہ بھی سو فیصد کامیاب نہ ہوئے۔ اور ضعاف ومناکیر بھی در آئیں۔ کتنے محدثین ہیں جنھوں نے سندوں کی خوب چھان پھٹک کی، اور حدیث بہت احتیاط کے ساتھ پیش کرنے کی پوری جدوجہد کی، مگر انھیں پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔ امام ابو عبداللہ حاکم جیسے جلیل القدر محدث پر کتنے شدید مواخذے ہوئے۔ امام ابنِ حبان جیسے ناقد پر تساہل کا الزام آیا۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی تصحیح و تحسین میں متساہل ٹھہرے۔

موصوف نے مقالے کے اختتام پر اپنی تصنیف ”احادیث قدسیہ“ کا بڑا برمحل تذکرہ کیاہے، اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ تقریروں کے لیے ہی لکھی گئی تھی۔ گویا پورے مقالے کا مضمونِ جملہ یہی ہے جس کے لیے یہ تفصیل کی گئی۔ کیوں کہ اگر تقریر کی تمام کتابوں کو ناقابلِ اعتبار نہ قرار دیا جائے گا تو آخر کیسے اس نئ تصنیف کی ترویج ہوسکے گی؟۔ بڑے بڑوں کی تقریروں پر تنقید نہ کی جائے گی تو آخر کیسے یہ تالیف سب کی توجہ کا مرکز بن سکے گی؟

---

بقیہ صفحہ نمبر 54 سے ملحق

تک تعلیم کے میدان میں ترقی نہ کریں۔ صدرِ مجلس پروفیسر ڈاکٹر ظفراقبال نے اپنے مختصر مگر جامع خطاب میں کہا کہ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی نے عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے دائرے کا انتخاب کیا تھا۔ انھوں نے کہا محبت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے جب کہ نفرت سکڑتی ہے۔ اعلیٰ حضرت نے رسول ﷺ کی محبت کو اختیار کیا اور نفرت و کثافت کے نظریات کو ختم کرکے اسلام کے امن و محبت کے آفاقی نظام کو عام کیا۔ اختتامِ کانفرنس پر معروف اسکالر اور رکن اسمبلی علامہ صاحبزادہ فضل کریم بھی تشریف لے آئے انھوں نے اپنے مختصر خطاب میں امام احمد رضا خاں کو بیسویں صدی کا امام قرار دیتے ہوئے کہا کہ عاشقانِ رسول ﷺ کے امام تھے۔ برعظیم میں امام صاحب نے عشقِ مصطفوی ﷺ کی شمع روشن کی وہ فتاویٰ نویسی میں ممتاز مقام رکھتے اور دو قومی نظریے کے علمبردار تھے۔ 31ویں امام احمد رضا کانفرنس کی نظامت کے فرائض پروفیسر مجید اللہ قادری نے پورے اعتماد اور وقار کے ساتھ کامیابی سے سرانجام دیے۔ پوری کانفرنس میں تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ کے حوالے سے عشقِ مصطفیٰ ﷺ اور تحفظ ناموس مصطفیٰ ﷺ کا جذبہ اور رنگ غالب رہا۔ پروفیسر مجید اللہ قادری اور ادارہ کامیاب کانفرنس کے انعقاد پر تحسین وستائش کے مستحق ہیں۔

(بہ شکریہ فرائیڈے اسپیشل، ۲۸ جنوری تا۳فروری ۲۰۱۱ء)

# امام احمدرضا اور ندوۃ العلماء

علامہ عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری رحمۃ اللہ علیہ

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۰ر شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء کو صوبہ یو۔ پی (بھارت) کے مشہور شہر بریلی شریف میں پیدا ہوئے، والدِ ماجد کا اسمِ گرامی مولانا نقی علی خاں رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) ہے۔ آپ کا تاریخی نام "المختار" تجویز ہوا۔ جدِ امجد مولانا رضا علی خاں رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۲ء) اپنے اس نونہال کو "احمد رضا" کہا کرتے تھے۔ علمائے اہلسنت و جماعت کی طرف سے آپ کو "اعلیٰ حضرت" اور "امامِ اہلِ سنّت" کے القاب ملے۔ لیکن علمائے حرمین شریفین نے اس نابغۂ عصر، یگانہ روز گار، مرکزِ دائرۂ تحقیق اور امامِ زمانہ کو چودھویں صدی کا مجدّد برحق قرار دیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود شمعِ رسالت کا یہ پروانہ اپنے نام کے ساتھ بڑے فخر سے "عبدالمصطفےٰ" لکھنے کا التزام کرتا تھا۔امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ کی ولادت کی تاریخ آیۂ کریمہ "اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ" میں موجود ہے اور سچ پوچھیے تو آپ کی سوانح حیات اسی قرآنی جملے کے اندر پوشیدہ ہے۔ واقعی اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں ایمان نقش فرمادیا تھا اور اپنی تائید واعانت سے اُنھیں ہمیشہ سرفراز رکھا، جس کے باعث انھوں نے چودھویں صدی میں تجدید دین وملت کا فریضہ بخیر وخوبی ادا کیا۔ دینِ برحق میں تحریف و تخریب کرنے والے اتنے سارے اُلصوصِ دین کی علم وفضل کے تمام تر دعاوی کے باوجود کوئی پیش نہ گئی اور بریلی کے اس مردِ قلندر نے تائیدِ ایزدی کے باعث مقدس شجر اسلام میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی قلمیں لگانے والوں کے بدنما چہروں کو بے نقاب کرکے رکھ دیا تھا۔

۱۴ر شعبان المعظم ۱۲۸۶ھ کو آپ نے تقریباً پونے چودہ سال کی عمر میں علومِ عقلیہ ونقلیہ کے اندر دسترس حاصل کرکے سندِ فراغ پائی اور اسی روز والدِ ماجد نے اپنی نگرانی میں منصبِ افتاء کی ذمّے داری آپ کے سپرد کردی۔ ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء میں اپنے والدِ ماجد کے ہمراہ مارہرہ شریف حاضر ہوئے اور شاہ آلِ رسول مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) کے دستِ حق پرست پر سلسلۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ میں بیعت ہوئے۔ مرشدِ برحق نے حاضری کے اسی موقع پر آپ کو اجازت وخلافت مرحمت فرمادی اور خرقے سے مشرف فرمایا۔ موصوف کو آپ کی ذات پر بڑا فخر تھا۔ ایک موقع پر فرمایا کہ "اگر باری تعالیٰ بروزِ حشر پوچھے کہ اے آلِ رسول! میرے لیے دنیا سے کیا لائے ہو؟ میں عرض کردوں گا کہ اے پروردگار! میں تیرے لیے احمد رضا لایا ہوں۔" ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں آپ نے والدین کریمین کے ہمراہ فریضۂ حج ادا کیا اور زیارتِ روضۂ انور سے مشرف ہوئے۔ دوسری مرتبہ آپ کو یہ سعادت ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں نصیب ہوئی۔ یہی وہ مبارک موقع تھا جب حرمین طیبین کی مقدس سرزمین پر حق وباطل کا فیصلہ ہوا اور علماء حرمین شریفین نے بالاتفاق آپ کو چودھویں صدی کا مجدّد قرار دیا اور اُن حضرات نے آپ سے سندیں اور اجازتیں لینا اپنے لیے سرمایۂ افتخار شمار کیا۔ آپ نے ان بزرگوں کو جو سندیں اور اجازتیں دیں ان کی نقلیں رسالہ "الاجازات المتینہ" میں موجود ہیں۔

امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ۲۵ر صفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء کو وصال ہوا۔ وفات سے کئی ماہ پیشتر رمضان المبارک کے مہینے میں بھوالی پہاڑ پر تاریخِ وفات کے لیے خامۂ قدرت نے آپ کی زبان پر یہ آیۂ مبارکہ جاری فرمائی تھی۔ "وَیُطَافُ عَلَیْهِمْ بِاٰنِیَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ"۔ ایک بزرگ نے آپ کے وصال کی خبر سُن کر معاً فرمایا "رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ" (۱۳۴۰ھ) غور سے دیکھا گیا تو اس جملے میں بھی تاریخِ وصال موجود تھی۔ جہاں قرآنِ کریم سے نکالی ہوئی تاریخ ولادت آپ کی پوری دنیاوی زندگی کا مکمل نقشہ پیش کرتی ہے، وہاں یہ قرآنِ عزیز ہی سے نکالی ہوئی الہامی تاریخِ وفات آپ کی اُخروی زندگی کا حقیقت افروز بیان معلوم ہوتی ہے۔ جو حضرات دنیاوی زندگی میں اپنا تن من دھن دینِ برحق کی حفاظت کے لیے داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اُخروی فوز و فلاح ہمیشہ کے لیے اُن کا مقدر ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیاوی زندگی کے تمام ہوتے ہی وہ خدا کے مہمان بن کر آغوشِ رحمت میں چلے جاتے ہیں اور ہر قسم کے آرام وراحت کے سامان اُن

کے لیے وقف ہوجاتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت، مجدد دین وملت امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے ہی شہیدانِ محبت، شمع رسالت کے پروانوں اور سرمایۂ ملت کے نگہبانوں میں سے ایک ہیں۔ ایسے حضرات کا وجود وقت کا اہم ترین تقاضا ہوتا ہے اور یہ ملت اسلامیہ کے عظیم الشان محسن ہوتے ہیں۔ امت مرحومہ کو ایسے بزرگوں کے وجود پر ہمیشہ ناز رہا ہے کیونکہ مقدس اسلام کی رگوں میں تازہ خون دوڑانے والی ہستیاں یہی ہیں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے قبل مسلمانانِ پاک وہند کے ساتھ انگریزوں کا ظالمانہ سلوک واضح تھا۔ اس جنگ میں چونکہ انگریزوں کے قدم بری طرح اُکھڑ گئے تھے اگرچہ بعض وطن دشمنوں کی بدولت اُنھیں استحکام نصیب ہوگیا اور مزید نوّے سال تک وہ اس ملک پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس تلخ تجربے کے باعث حکومتِ وقت بہت حساس ہوگئی تھی۔ انگریزوں کی اسلام دشمنی میں اگرچہ ۱۸۵۷ء کے بعد اور بھی شدّت آگئی تھی لیکن اب اس عداوت کو پُراسرار بنالیا گیا تھا۔

مسلمانوں کو زہر کی گولیاں اب بھی کھلائی جاتی تھیں لیکن شہد میں لپیٹ کر اور چاندی سونے کے خوشنما ورق لگاکر۔ ساتھ ہی حکومت یہ گولیاں اپنے ہاتھ سے نہیں کھلاتی تھی اور نہ کسی انگریز کو اس کارگزاری پر مامور کیا جاتا تھا بلکہ اس خدمت کے لیے انھوں نے مسلمانوں کے بعض علما اور لیڈر خرید رکھے تھے اور عام مسلمانوں کو یہ باور کروانے پر پورا زور لگادیا جاتا ہے کہ یہی تمھارے خیر خواہ لیڈر، مصلح، ریفارمر، مجاہد، مبلغ، رہنما اور مسیحائے قوم ہیں۔ اس پُراسرار دور میں بدخواہوں کو خیر خواہ، گمراہ گروں کو لیڈر اور رہنما، مفسدوں برٹش نوازوں کو مجاہد، حکومت کا نفسِ ناطقہ بن جانے والوں کو مبلغِ اسلام اور مسلمانوں کو انگریز پرستی کا درس دینے والوں کو مسیحائے قوم قرار دیا جاتا تھا۔ بعض لوگ یہی سمجھ بیٹھتے تھے کہ واقعی یہ ہمارے خیر خواہ ہیں اور ہمارے ہی فائدے کی خاطر رات دن مارے مارے پھر رہے ہیں حالانکہ اُن کی ساری تگ و دو اسی لیے تھی کہ مسلمانوں کو برٹش نوازی کا کلوروفارم سُنگھا کر حکومتِ وقت کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ اس کے صلے میں حکومت کی جانب سے اُن پر عنایات کی ایسی بارش ہوتی کہ پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوتا۔ رہا مسلمانوں کا معاملہ تو زبانی جمع خرچ اور ہمدردی کے خوشنما خالی دعاوی کے سوا انھیں اپنی قوم کے نفع نقصان، اقبال وادبار، ترقی و تنزل اور جینے مرنے سے نہ کوئی دلچسپی رہی تھی اور نہ کسی قسم کا کوئی لگاؤ تھا۔ وہ تو صرف اپنا اُلّو سیدھا کر رہے تھے۔

بعض علماء جن کی خدمات حکومت نے حاصل کرلی تھیں وہ شرک وبدعت کی بیخ کنی کا دعویٰ کرتے تھے لیکن اندرونِ خانہ مقدس شجر اسلام میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی قلمیں لگارہے تھے۔ مسلمانوں کی اخلاقی خرابیوں کو دور کرنے کا ڈھول بجاتے تھے لیکن یہ محض مسلمانوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور اپنی دوکان چمکانے کے لیے تھا۔ اُن کی بھاگ دوڑ کو دیکھ کر ہی محسوس ہوتا تھا کہ قوم کی خیر خواہی اور دین کا درد ان بیچاروں کو آرام سے بیٹھنے نہیں دیتا حالانکہ وہ اسلام و مسلمین کے بدخواہ اور برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ تھے۔ اُن میں سے جس کی دوکان خوب چلی اُس نے اہلِ حق سے علیحدگی اختیار کرکے، مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے منہ موڑا، اہلسنت وجماعت سے رشتہ توڑا اور یوں اپنی علیحدہ مسجدِ ضرار بنائی کہ اپنا اپنا نیا فرقہ ہی بنا بیٹھے۔ اسی بدخواہی کے باعث انگریزوں کے دورِ اقتدار میں متحدہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے کئی فرقے معرضِ وجود میں آگئے جو اپنے روزِ اوّل ہی سے اپنی اپنی حقانیت کے دعویدار اور اہلِ سنّت وجماعت کو مُشرک وبدعتی وغیرہ بتاکر ان سے برسرِپیکار چلے آرہے ہیں۔ یہ تھی اسلام دشمنی کی وہ برطانوی سازش جس کی شدت میں آج تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ افسوس!

راہزن خضر راہ کی قبا چھین کر
رہنما بن گئے دیکھتے دیکھتے

امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ جب سنِ شعور کو پہنچے تو صورتِ حال کا گہرا مطالعہ کیا۔ قوم کے نام نہاد لیڈروں کی ابن الوقتی دیکھی اور علمائے سوء کی پُراسرار تخریب کاری پر نظر گئی جو رہنمائی کے پردے میں رہزنی کررہے تھے، خیر خواہوں کے بھیس میں بدخواہی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کررہے تھے۔ تو اسلام و مسلمین کے اس سچے خیر خواہ اور سرمایۂ ملّت کے نگہبان کا خون کھول اٹھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ جس سچے اسلام کو حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی ۴۶۵ھ) اور سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیری حسن سنجری علیہ الرحمۃ (المتوفی ۶۳۳ھ) وغیرہ بزرگ اس ملک میں لے کر آئے تھے۔ اور اس درخت کو اپنے خون پسینے سے سینچا تھا اور اکبری دور میں اسی شجر اسلام پر جب دینِ الٰہی کی صورت میں خزاں چھانے لگی تھی تو شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) نے اسی سرمایۂ ملت کی نگہبانی کا فریضہ ادا کیا تھا اُسی مقدس شجرِ اسلام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اُس کی جگہ اپنے اپنے خانہ ساز اسلام مسلمانوں میں رائج کرنے اور اُن میں سے ہر ایک کو اصلی اور سچا اسلام منوانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر آپ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ اٹھے اور شب و روز مضطرب رہنے لگے۔ نصاریٰ کی حکومت میں اُن لصوص دین کے ساتھ تلوار لے کر جہاد تو ہو نہیں سکتا تھا۔ علاوہ بریں حکومتِ وقت اُن کی پُشت پناہ تھی۔ دریں حالات قلم ہاتھ میں تھا اسی سے شمع اسلام کے اس پروانے اور فتوحاتِ مدینہ کے دیوانے نے شمشیر و سناں کا کام لیا اور جملہ گمراہ گروں کے مقابلے پر آپ یہ کہتے ہوئے میدانِ کارزار میں کود پڑے

اگر چہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لاالٰہ الااللہ

امام احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمۃ نے مبتدعین کے ہر سرغنے کو ٹوکا، اُسے سمجھایا بجھایا، خوفِ خدا و خطرۂ روزِ جزایاد دلایا، لیکن وہ حضرات حکومتِ وقت کے ہاتھوں میں چوں قلم دردست کاتب ہو چکے تھے، آخرت کو دنیا کے آرام وراحت پر قربان کر چکے تھے اور چرب لقموں نے اُن کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا اس لیے نہ انھوں نے اس بے راہ روی سے باز آنا تھا اور نہ کسی بھی فہمائش سے باز آئے۔ جب اسلام و مسلمین کے اُن بدخواہوں اور رہبروں کے بھیس میں رہزنی کرنے والوں کے راہِ راست پر آنے کی کوئی ہلکی سی اُمید بھی نظر نہ آئی تو میدانِ کارزار بھڑک اُٹھا۔ قلمی میدان میں ایسا گھمسان کا رن پڑا جس کی نظیر پاک و ہند کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ آخر کار جب مطلع صاف ہوا تو سب نے دیکھا کہ جملہ مبتدعین علم و فضل کے تمام تر دعاوی کے باوجود سر پر پاؤں رکھ کر میدان سے بھاگ گئے ہیں۔ اُن میں سے کسی کے اندر بھی علمی محاذ پر آپ کے سامنے ٹھہرنے کی جرأت نہیں رہی تھی۔

اُس وقت محمدی کچھار کے اس شیر، چودھویں صدی کے مجددِ برحق، امام احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمۃ کی زبان پر بار بار یہی الفاظ آرہے تھے

کلکِ رضا ہے خنجر خونخوار برق بار
اعداء سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

**ندوہ کا برطانوی جال:** مولوی سلیمان ندوی کی سربراہی کے زمانے سے تو ندوہ ایک دیوبندی ادارہ ہو کر رہ گیا ہے لیکن اپنے یومِ تاسیس سے علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۹۱۴ء) کی وفات تک یہ ادارہ نیچری مکتبۂ فکر کا علمبردار اور برطانوی شکاریوں کا بچھایا ہوا ایک ایسا پُر اسرار جال تھا جو اہلِ حق کو گرفتار کرنے اور علمائے اہلِ سنّت کا شکار کرنے کے لیے بچھایا گیا تھا۔ اس ادارے کے کرتا دھرتا۔ جن لوگوں کو بنا دیا گیا وہ زیادہ تر بد مذہب تھے۔ بعض علمائے اہلِ سنّت جو اس کے خوشنما اعراض و مقاصد سے خوش ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے تھے انھوں نے صورت حال کا انکشاف ہونے پر باری باری علیحدگی اختیار کرلی اور آخر کار اس میں وہی رہ گئے جو برٹش گورنمنٹ کے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حکومت کے ہاتھوں میں چوں قلم دردست کاتب بن چکے تھے۔ یہ حضرات حق و باطل کا فرق مٹانے اور اہلِ حق کو اقتدار کی چوکھٹ پر جھکانے کا فرض پوری وفاداری اور خیر خواہی سے ادا کرنے میں شب و روز کوشاں رہتے تھے۔ وہ صرف برٹش گورنمنٹ کی خوشنودی کے خواہاں تھے۔ جس کے باعث نہ وہ اہلِ حق کو اس برطانوی جال میں پھنسانے پر کوئی عار محسوس کرتے تھے اور نہ اُنھیں بد مذہبوں اور گمراہ گروں کو قوم و ملت کے رہنما اور پیشوا باور کروانے میں خوفِ خدا و خطرۂ روزِ جزا کا ذرا بھی احساس ہوتا تھا۔ ندوہ کی مضرت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے اراکین میں نیچری، غیر مقلد، دیوبندی اور روافض تک موجود تھے۔ بلکہ ستم ظریفی کی انتہا ملاحظہ ہو کہ برٹش گورنمنٹ کا بنایا ہوا قمر الانبیاء یعنی مرزا غلام قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) جیسے دجال کا بیٹا مرزا بشیر الدین محمود بھی اس ادارے کا باقاعدہ ممبر تھا۔ غرضیکہ جملہ باطل پرستوں کے ہاتھ میں اس ادارے کی کلید تھی اور اس کے اغراض و مقاصد ساحرین برطانیہ کے اشارۂ چشم وابرو کے مرہونِ منّت تھے۔ گویا اس مشین کو چلانے والی طاقت حکومتِ وقت تھی اور اس کے کُل پُرزے وہ علماء تھے جنھوں نے اپنی ملّت فروشی کو جبوں

اور عماموں میں چھپایا ہوا تھا۔

اس آئینے میں دیکھا جائے تو ندوہ کے دو دَور ہیں۔ پہلے دَور کی مدّت بیس اکیس سال ہے یعنی ندوہ کے روزِ تاسیس ۱۸۹۳ء سے علامہ شبلی نعمانی کی وفات ۱۹۱۴ء تک اور دوسرا دَور ۱۹۱۴ء سے آج تک کا زمانہ ہے۔ دوسرے دَور میں ندوہ کو اپنی ناکامی کا پورا پورا احساس ہو گیا تھا۔ اس لیے مولوی سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء) نے اسے ایک دیوبندی ادارہ بنا کر رکھ دیا۔ دوسرے دَور میں اس ادارے نے تصنیف و تالیف کا بے مثال کام کیا ہے تصنیف و تراجم کا اتنا کام کیا ہے جو دوسرے کسی ادارے سے کیا نہیں جا سکا ہے۔ اختلافِ مسلک سے قطع نظر قلمی میدان میں ایسا جاندار کام کیا ہے کہ لکھنے والوں کے لیے مثالیں قائم کیں اور قلمکاروں میں خاص شعور پیدا کر کے اُردو زبان میں بھی معیاری تخلیقات منظرِ عام پر لانے کے راستے متعین کر کے دکھا دیے۔ کاش! یہ ادارہ اپنے مسلک کی ناہمواری کا احساس کر کے ایک جدید فرقے سے وابستہ نہ ہوتا بلکہ حقانیت کا علمبردار بن کر اہلِ حق کے عقائد و نظریات کو سینوں میں جگہ دیتا اور ناجی گروہ اہلِ سنّت و جماعت کی ترجمانی کا فریضہ ادا کرتا، یہ ادارہ پہلے دور کے آسمان سے تو گر پڑا تھا لیکن افسوس دیوبندیت کے کھجور میں آ اٹکا ہے۔

ہمارا روئے سخن یہاں ندوے کے دوسرے دور کی جانب نہیں بلکہ اُس ندوہ کی طرف ہے جو کچھ ندوہ اپنے پہلے دور میں تھا۔ اُسی ابتدائی ندوہ کے بارے میں مجدد مائۃ حاضرہ، امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ "فتاویٰ الحرمین برجف ندوہ المین" (۱۳۱۷ھ) ہے جو علمائے حرمین شریفین کی تصدیقات سے منور و مزین ہے اُس دور میں ندوہ حق و باطل کو خلط ملط کرنے کی ایک کھچڑی تھی۔ اہلِ حق کو گرانے، باطل پرستوں کو اٹھانے اور حق و باطل کا فرق مٹانے کے لیے ساحرینِ برطانیہ نے یہ ایک چال چلی تھی۔ یہ چال برٹش گورنمنٹ کے زیرِ سایہ پلی تھی۔ نیچریت و دہریت کی آغوش میں پھولی پھلی تھی اور اہلِ حق کو اپنے جال میں پھنسانے حق و باطل کا فرق مٹانے کے لیے صلح کلیت کے سانچے میں ڈھلی تھی۔ حکیم عبدالحی لکھنوی نے قیامِ ندوہ کے بارے میں جو تصریح کی ہے اُس کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے: "۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) میں مدرسۂ فیضِ عام کانپور میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں بہت سے علمائے کرام تشریف لائے یہ وہی اجتماع تھا جس میں ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کے اغراض و مقاصد تھے کہ مسلمانوں کو متحد کیا جائے۔ اس اجتماع میں مفتی احمد رضا خاں بھی شامل ہوئے تھے، لیکن جلد ہی اس سے جدا ہو گئے اور ندوہ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ ندوۃ العلماء کے خلاف انھوں نے ایک رسالہ "تحفۂ حنفیہ" کے نام سے جاری کیا۔ علاوہ بریں ندویوں کے رد میں ایک سو کتابیں لکھیں اور علمائے ہند سے ندویوں کی تکفیر کے فتوے پر تقریظیں حاصل کیں۔ اُن سب کو یکجا کر کے کتابی شکل دی اور مجموعے کا نام "فتاویٰ السنہ لالجام اہل الفتنہ" رکھا[۱]۔"

شیخ محمد اکرم صاحب نے قیام ندوہ کے بارے میں اپنی تحقیق یوں پیش کی ہے: "اس عمدہ خیال کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلیکٹر تھے مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری خلیفۂ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جو اس کے بانی اور ناظمِ اوّل تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحبِ "تفسیرِ حقانی" نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے۔ اکابرِ قوم مثلاً سر سید، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک نے بھی اس کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعے سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۸۹۸ھ میں دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھولے گئے۔ ۱۸۹۹ء میں رُوسائے شاہجہان پور کی فیاضی سے کچھ زمینداری بطورِ وقف ندوۃ العلماء کو حاصل ہوئی[۲]۔"

سنگِ بنیاد رکھے جانے اور حکومت کی مالی امداد کے بارے میں شیخ صاحب یوں رقمطراز ہیں: "ندوہ کی تاریخ میں ۱۹۰۸ء کا سال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال صوبے کے گورنر نے دارالعلوم کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا اور حکومت کی طرف سے ندوہ کو بعض مقاصد کے لیے پانچ سو روپیہ ماہوار امداد ملنی شروع ہوئی۔"[۳]

جب گورنر صاحب نے ندوہ کا سنگِ بنیاد رکھا تو اُس وقت علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) کے تاثرات یہ تھے "یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء عیسائی فرماں روا کے سامنے دِلی شکر گذاری کے ساتھ ادب سے خم تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سُنی ایک مذہبی درسگاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے، یہ پہلا

ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درسگاہ کا سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جارہا تھا۔ غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سُنی، حنفی، وہابی، رِند، صوفی، واعظ، خرقہ پوش اور کج کلاہ سب جمع تھے۔"[۴] ندوہ جس حالت میں قائم ہوا اور جن خطوط پر چل رہا تھا۔ اس کے پیشِ نظر کسی جماعت اور فرقے کے علمانے بھی اُسے نظر استحسان سے نہیں دیکھا۔ صرف وہی علما اس کے مداح تھے جو سازش کا شکار ہو کر اس کے کارندے بن گئے تھے۔ اتفاق کرنے والوں میں سے بھی کتنے ہی علماء صورتِ حال ظاہر ہونے پر اس سے نفرت کرنے لگے اور فوراً علیحدہ ہو گئے۔ چنانچہ اُس وقت کے ندوہ سے متعلق دیوبندی فرقے کے حکیم الامت، مولوی اشرف علی صاحب تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) نے اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کیا تھا: "پھر خود ندوہ کا جو حشر ہوا سب کو معلوم ہے کہ وہ ایسوں کے ہاتھ میں مدّت تک رہا جن کی طبیعت میں بالکل نیچریت تھی۔ وہی سر سیّد احمد خاں کے قدم بقدم اُن کی رفتار رہی۔ وہی جذبات، وہی خیالات، کوئی فرق نہ تھا۔"[۵] سر سید احمد خاں (المتوفی ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء) کے متعلق تھانوی صاحب کی رائے یہ تھی: "یہ سب انگریزی تعلیم اور نیچریت کی نحوست ہے کہ لوگوں کے عقائد، اعمال، صورت، سیرت سب بدل گئے اور دین بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ اُن کی رفتار، گفتار، نشست و برخاست، خورد و نوش سب میں دہریت و نیچریت والحاد کا رنگ جھلکتا ہے اور ہندوستان میں نیچریت کا بیج سر سید کا بویا ہوا ہے۔"[۶]

گاندھوی حضرات کے امام الہند، مولوی ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء) کافی عرصہ چونکہ ندوہ میں رہے تھے، اس لیے اُن پر ندوہ کے چودہ طبق روشن تھے اور درونِ خانہ کا کوئی بھید اُن سے پوشیدہ نہیں تھا۔ انھوں نے بعض ایسی چیزیں بھی دیکھیں جن کے باعث علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ چنانچہ ندوہ کے بظاہر خوشنما اور حقیقت میں پُر فریب جال کی کہانی گاندھویوں کے امام الہند کی زبانی سنیے موصوف اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں: "ندوۃ العلماء کے اجتماع سے مجھے روشن علما کی جو حالت منکشف ہوئی، کیونکہ منتسبین ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حسنِ ظن تھا۔ اس سے طبیعت کو اور زیادہ مایوسی اور طبقۂ علما کی طرف سے سخت وحشت پیدا ہو گئی۔ مخالفینِ ندوہ وہاں جو کچھ کر رہے تھے اُن کی نسبت تو خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں ہیں لیکن جو لوگ ندوے کے لیے سرگرم تھے اُن کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی۔ چونکہ پانچ چھ مہینے تک اُن سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھتا رہا۔ اس لیے اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک دنیاداروں کی سی کارروائیاں کی جارہی ہیں اور وہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لیے شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لئے ہر طرح کی عیاریاں کی جاتی تھیں۔ میرے سامنے ایک واعظ نے ندوے کے ایک سرگرم ایجنٹ سے مشورہ کیا کہ مجلسِ وعظ میں کیونکہ اُن کو اظہار جوش و خروش کرنا چاہیے اور کیونکہ آخر میں نالہ و بکا شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ تجویز پختہ ہو گئی۔ اس کے بعد واعظ نے جونہی مثنوی کی ایک حکایت شروع کی دوسرے صاحب نے معاً کھڑے ہو کر چال بازوں کی طرح حرکتیں شروع کر دیں۔ اس سے مجلسِ وعظ میں بڑی رقت ہو گئی اور اس قدر آہ و بکا ہوا کہ اُس پر وعظ ختم کر دیا گیا۔ اس طرح کی بیسیوں باتیں روز میں دیکھتا تھا اور میرے دل میں اس طبقے (علماء) کی طرف سے وحشت بڑھتی جاتی تھی۔"[۷]

گاندھوی حضرات کے امام الہند، جناب ابوالکلام آزاد نے ندوے میں گھس کر اُس کے کارکنوں کی شاطرانہ چالیں اور عیاریاں دیکھیں اور دیوبندی حضرات کے حکیم الامت و مجدد دین و ملت کہلانے والے مولوی اشرف علی صاحب تھانوی نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ ندویوں میں دہریت والحاد کی تخم ریزی کی گئی ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات نے اصلاح ندوہ کے لیے کس حد تک کوشش کی؟ اگر ناقابلِ اصلاح دیکھا تو اس فتنے کی بیخ کنی کا فریضہ کس حد تک ادا کیا؟ مسلمانانِ ہند کے جسد میں جو یہ ناسور پیدا کر دیا گیا تھا اس کا ان حضرات نے کیا علاج کیا؟ اس کا جواب یقیناً یہی ملے گا کہ ان حضرات نے کچھ بھی علاج نہیں کیا کیونکہ علاج کرنا طبیب کا کام ہوتا ہے اور بدقسمتی سے یہ دونوں حضرات خود بھی ایمانی وروحانی مریض تھے اور مرض بھی ایسا شدید تھا جس نے آخری وقت تک کسی علاج کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

قربان جائیں اس صدی کے مجدّدِ برحق امام احمد رضا خاں

بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مومنانہ فراست اور مردانہ عزم وہمت پر جنھوں نے پوری قوت کے ساتھ اس فتنے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اس برطانوی شرارت کو پوری طرح بے نقاب کیا۔ ندوہ کی کارگزاری اور سراسر غیر اسلامی روش کا رد کرتے ہوئے ایک سو کتابیں لکھیں تحریر وتقریر کے ہر میدان میں اراکینِ ندوہ کو سمجھایا بجھایا خوفِ خدا و خطرۂ روزِ جزا یاد دلایا، جب وہ کسی طرح بے راہ روی اور ملّتِ اسلامیہ کی بدخواہی سے باز نہ آئے تو ندوہ کی مشین کے ہر چھوٹے بڑے پُرزے کا وہ علمی محاسبہ کیا کہ دلائل کے میدان میں کسی کے اندر بولنے، منہ کھولنے کی جرأت نہ رہی۔ بریلی کے اس مردِ حق آگاہ نے تائیدِ ایزدی سے حق و باطل کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچ دیا، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرکے دکھادیا۔

مجددِ مائۃ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ علیہ نے اراکینِ ندوہ کی خلافِ اسلام حرکتوں اور اسلام دشمنی کی کارگزاریوں پر فہمائش کی لیکن اُن حضرات کی روش میں کوئی فرق نہ آیا کیونکہ وہ ساحرینِ برطانیہ کے ہاتھوں میں چوں قلم دردست کاتب ہوگئے تھے تو آپ نے سرمایۂ ملت کی نگہبانی کا فریضہ ادا کرنے اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے باعث اس فتنے کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس سلسلے میں آپ کی مساعیِ جمیلہ کا خاکہ یہ ہے: (۱) ندوہ کی کارگزاری کا جائزہ لینے کی خاطر ایک مستقل رسالہ "تحفۂ حنفیہ" کے نام سے جاری فرمایا۔ (۲) ندوہ کے فتنے کا استیصال کرنے کی غرض سے "جدوہ" کے نام سے راسخ العقیدہ مسلمانوں کی ایک تنظیم بنادی گئی۔ (۳) جس شہر میں اراکینِ ندوہ کا جلسہ ہوتا وہاں علمائے اہلِ سنّت کو لے کر آپ بالمقابل جلسے کرکے ندویوں کی خلافِ اسلام حرکتیں بیان کرکے مسلمانوں کو ان کے خوشنما اور پُر فریب جال میں پھنسنے سے بچاتے اور اراکین ندوہ کو مقدس اسلام کا واسطہ دے کر گفتگو کی دعوت دیتے تھے۔ (۴) اراکینِ ندوہ کے بے راہ روی سے باز نہ آنے پر اُن کے رَد میں ایک سو کتابیں تحریر فرمائیں، جن میں سے ایک کا جواب بھی کسی بڑے سے بڑے ندوی سے نہ ہوسکا تھا۔ (۵) اراکینِ ندوہ کی خلافِ اسلام باتوں کے خلاف ایک فتویٰ مرتب کرکے اُس پر متحدہ ہندوستان کے علمائے کرام کی تصدیقیں حاصل کیں اور اس مصدقہ رسالے کو "انجام السلہ" کے نام سے پورے ملک میں مشتہر کیا تاکہ عوام الناس اس صلح کلیت کے پُر اسرار فتنے سے باخبر ہوجائیں اور بے خبری میں اپنی ایمان جیسی متاعِ عزیز کو ضائع نہ کربیٹھیں۔ نیز ۱۳۱۷ھ /۱۸۹۹ء میں آپ نے ندوہ کے بارے میں ایک فتویٰ مرتب کرکے اُسے علمائے حرمین شریفین کی خدمت میں بھیجا۔ اُن حضرات نے آپ کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے شدومد سے اُس پر تقریظیں لکھیں۔ یہی وہ رسالہ ہے جو "فتاوی الحرمین برجف ندوۃ المین" (۱۳۱۷ھ) کے تاریخی نام سے شائع ہوا۔

حق یہ ہے کہ تاج الفحول مولانا عبد القادر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ اور مجددِ مائۃ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ندوہ کی شرارت کا ڈٹ کر مقابلہ کرکے اسلام و مسلمین کی خیر خواہی کا وہ حق ادا کیا جس پر پاک و ہند کے مسلمانوں کو ان حضرات کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جب ابتدائی ایام میں اراکینِ ندوہ نے ملک کے خاص خاص شہروں میں ندوہ کے جلسے کرنے اور بے خبر مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسانے کا پروگرام بنایا تو مجددِ برحق نے اس شرارت کو جس طریقے سے زندہ درگور کیا تھا اُس کی کہانی مولانا حسنین رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنیے۔ "ندوہ نے اپنے نئے دین کو ہندوستان میں پھیلانے کے لیے دوروں کا بہت بڑا پروگرام بنایا تو بریلی سے ابتدا کرنے کی اس لیے سوجھی کہ امام بریلوی قدس سرہ نے اس کے خلاف مضبوط قدم اٹھایا تھا، کم از کم خاموشی سے ہی یہاں جلسے ہوجاتے تو پورے ہندوستان کو فریب دینے کا موقع ہاتھ آجاتا۔ تحریکِ ندوہ کے سرگرم کارکن بریلی میں جمع ہوئے جن میں بھول سے شریک ہوجانے والے چند سُنی علما بھی تھے۔ مثلاً مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور ان کے استاد محترم، مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی۔ جنھیں جگت استاد کہا جاتا تھا۔ آپ کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ حضرت امام بریلوی قدس سرہ کو جونہی ان حالات کی اطلاع ملی، آپ نے ندوہ کے ذمّے داروں کو اُن کی کھلی ہوئی غلطیوں پر تنبیہ کی۔ تحریری و زبانی طریقوں سے اصحابِ ندوہ کو بحث و تحقیق کی دعوت دی تاکہ اسلام کی حقانیت اور ندوہ کے نئے دین کا بطلان واضح ہوجائے مگر وہ ندوہ جو اپنی کمزوریوں اور فتنوں کو خوب جانتا تھا کب بحث و تمحیص اور حق قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ مجددِ اعظم امام بریلوی قدس سرہ کی ایک مختصر مگر ہدایت انگیز تحریر نے حضرت مولانا احمد حسن صاحب

کانپوری کو بے قرار کر دیا۔ آپ نے امام بریلوی قدس سرہ کی ہدایت پاتے ہی خادم کو بستر باندھنے کا حکم دیا۔ یہ خبر ساری ندوہ تحریک میں پھیل گئی جب آپ کے استاد مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے اپنے شاگرد مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کو بلوایا اور سبب دریافت کیا۔ مولانا احمد حسن صاحب نے امام بریلوی قدس سرہ کا وہ رقعہ پیش کر دیا۔ استاد موصوف نے بآں شانِ اُستادی و وسعت حلقۂ تلامذہ یہ خیال بھی نہ فرمایا کہ ہدایت کی ابتدا میرے ایک شاگرد کی طرف سے ہو رہی ہے۔ فوراً حق کو قبول کر لیا۔ یہ دنوں حضرات اور ان کے بہت سے ساتھی ندوۃ العلما سے متنفر ہو کر الگ ہو گئے۔ مولانا لطف اللہ صاحب تو پہلی گاڑی سے سیدھے علی گڑھ روانہ ہوگئے اور مولانا احمد حسن صاحب کانپوری امام بریلوی قدس سرہ کی عیادت کو تشریف لائے۔ اس طرح جماعت سے علمائے اسلام جو ندوہ کے نئے دین کے فتنوں پر مطلع ہوتے گئے ندوہ سے الگ ہوگئے۔

ندوہ کے بریلی اجلاس کی جو درگت ہوئی اُس نے ندوہ تحریک اور اصحابِ ندوہ پر اثر تو ضرور ڈالا مگر ذمے دارانِ ندوہ شاید یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ مقامی اثرات کے نتائج ہیں۔ پٹنہ (بہار) کے دوسرے اجلاس میں اپنے حوصلے نکالنے کا تہیہ کیے ہوئے روانہ ہوگئے۔ امام بریلوی قدس سرہ جو ہر نشیب و فراز کو خوب جانتے تھے، نیز آپ کی دینی منشا ندوہ تحریک کے سلسلے میں بریلی اجلاس کے وقت پوری نہ ہوئی۔ ندوۃ العلما کا پٹنہ اجلاس کچھ اور ہی غمازی کر رہا تھا۔ پٹنہ سفر کا عزم فرمالیا۔ آپ کے ساتھ کئی علمائے کرام اور دوسرے حضرات ہم سفر ہوگئے، جن میں مولانا عبد القادر بدایونی، مولانا سید اسمٰعیل حسن مارہروی، مولانا عبد السلام جبلپوری قابلِ ذکر ہیں۔ امام بریلوی قدس سرہ کا یہ پورا قافلہ بھی پٹنہ پہنچ گیا اور مولوی قاضی عبد الوحید صاحب رئیس اعظم پٹنہ کے ہاں قیام فرمایا۔ پٹنہ پہنچ کر ندوہ کے ذمے دار لوگوں کو زبانی اور تحریری دعوتیں دی گئیں۔ کئی اجلاس منعقد کرکے ندوہ تحریک کے بدترین نتائج اور عظیم دینی نقصانات کو واضح کیا گیا اور انھیں نئے دین کی تجویز و اشاعت پر تنبیہ کی گئی۔ ذمے دارانِ ندوہ بجائے اس کے کہ دین اور ملّتِ اسلامیہ کے تحفظ کی خاطر اس معاملے کو طے کر لیتے اپنی بات بنائے رکھنے کے لیے دین وملت کا عظیم ترین نقصان گوارا کیا اور یہ عذر کر گئے کہ کلکتہ کا پروگرام قریب ہے۔

یہاں ہم بات چیت میں مصروف ہوگئے تو کلکتہ کا پروگرام خراب ہو جائے گا۔ افسوس کہ ندوہ والے دین وملت کی بربادی کو اچھا سمجھتے رہے۔ اور اپنے تباہ کن پروگرام پر آنچ نہ آنے دی۔

ندوہ والے ان حیلوں سے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ جان چھوٹی لاکھوں پائے۔ کلکتہ پہنچ کر اپنی تحریک میں جان ڈالیں۔ تیسرے اجلاس کے لیے کلکتہ پہنچ گئے۔ بہت سے دیوبندی مولویوں کو بھی اکٹھا کر لیا۔ اور ندوہ تحریک کے لیے اُن کی بڑی تعداد کلکتہ میں جمع ہوگئی۔ امام بریلوی قدس سرہ جو اُن کے حیلوں سے خوب واقف تھے، تحفظِ ملّت کی خاطر ان حالات میں کب اُن کا پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ آپ اپنی جماعت کے ساتھ کلکتہ پہنچ گئے اور پوری قوت کے ساتھ ندوہ والوں کو تنبیہ کی کہ: "ندوہ کی تحریک نے اسلام میں جو ترمیم و تنسیخ کی ہے اس پر ایک بار گفتگو ہو جائے۔ فرقہ پرستی کی لعنت سے مسلمانوں کو بچایا جائے۔ اس قسم کی نئی جماعت بنا کر مسلمانوں میں پھوٹ نہ ڈالی جائے"۔ ساتھ ہی کلکتہ میں اہلِ سنّت کے جلسے زور شور سے ہونے لگے۔ اصحابِ ندوہ یہاں بھی ٹال مٹول کی پالیسی پر چلتے رہے اور آخر یہ تجویز پاس کرنے پر مجبور ہوئے کہ: "ندوۃ العلما کا پروگرام عامۃ المسلمین کے سامنے رکھ کر جب تک استصواب نہ کر لیں ہم دوسری طرف متوجہ نہیں ہوسکتے"۔ اس جواب نے کلکتہ کے مسلمانوں کو ندوۃ العلما سے اور متنفر کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کی اس تحریک کا سارا زور ختم ہو گیا۔ اہلِ سنّت کے مزید جلسوں نے بہت ہی زیادہ اثر کیا کہ ندوہ کی وہ تحریک کلکتہ ہی میں دفن ہوگئی اور ہندوستان گیر دورے سِسک سِسک کر رہ گئے۔"[۸]

غرضیکہ آپ نے ہمتِ مردانہ اور جذبِ قلندرانہ سے ندوہ کے ملک گیر جلسوں کا ناطقہ بند کرکے اضلال و تضلیل کے اس سیلاب کے سامنے بند باندھا اور اسلام و مسلمین کی خیر خواہی کا فریضہ مجددانہ انداز میں ادا کرکے اہلِ اسلام کو گمراہ ہونے سے بچالیا ارا کینِ ندوہ میں مجددِ مائۃ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کے سامنے آنے، علمی میدان میں گفتگو کرنے کی جرأت ہی کہاں تھی کہ محدی کچھار کے اس شیر کے رُوبرو آتے۔ ندوہ کی بگڑی کو بناتے۔ چنانچہ مولانا یقین الدین قادری بریلوی نے اسی حقیقت کو اپنے لفظوں میں صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے یوں بیان کیا ہے:

"واقعی اس میں اُن پر اور تمام اکابرِ ندوہ میں کسی پر الزام نہیں، گفتگو کرتے کس جگر سے؟ شیر انِ شرزہ کے مقابل آنا کچھ ہنسی کھیل نہ تھا۔ ریاضی ہندسے کی دو چار کتابیں الٹی سیدھی پڑھا دینا نہ تھا۔ ڈاکٹر وزیر خاں کی کتابوں سے کچھ مضامین لے کر خرافاتِ نصاریٰ کے رَد میں کچھ لکھ لینا نہ تھا۔ کچھ مثنوی شریف کے شعر اور کچھ ادھر اُدھر کی داستانیں کچھ، تمثیلیں، کہاوتیں جوڑ گانٹھ کر عوام پسند وعظ کہہ لینا نہ تھا۔ یہ مرد آزما میدان تھا۔ اسد انمبر کا نیستان تھا، جس کا نام لیے پرانے پر انوں کے جی دہلتے ہیں۔ بڑے بڑے دم سادھے، قدم بڑھائے، چُپ کی ٹٹی کو آڑ بنائے نکلتے ہیں۔"[9]

مولوی محمد علی مونگیری ناظم ندوہ نے ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۱۳ھ کو امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے جو خط بھیجا تھا اُس میں مجددِ برحق کے بارے میں اپنے یہ تاثرات بھی سپردِ قلم فرمائے تھے: "مولانا آپ بفضلہٖ تعالیٰ اس زمانۂ پر فتن میں اسلام کے رُکنِ اعظم ہیں۔ ندوہ آپ حضرات کی شرکت کا بہت محتاج ہے"[10]

اب ندوہ کے نفسِ ناطقہ مولوی عبدالحق صاحب حقانی دہلوی کے تاثرات دیکھیے اور غور فرمایئے: "حقانی صاحب نے حضرت عالمِ اہلِ سنّت (فاضل بریلوی) سے تخلیہ کے لیے کہا اور جناب مولانا محدث سورتی کو بھی اپنے ہمراہ لیا۔ تینوں صاحب مکان کے ایک درجہ بالا میں جا کر بیٹھے۔ یہاں حقانی صاحب کھُلے۔ خود بیان فرمایا کہ میں نے تو اُس عبارت پر دستخط کر دیئے تھے۔ مگر اور صاحبان نے نہ مانا اور حضرت عالمِ اہلِ سنّت (اعلیٰ حضرت) سے کہا کہ میں تو بالکل آپ کا ہم مذہب بلکہ ہم مشرب ہوں۔ میں تو آپ کی اِن کوششوں پر خوش ہو رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف سے ایک شیر کو قائم فرما دیا ہے۔ میں نے جو دوورقی تحریر آپ کے مقابل لکھی وہ بھی جنگ زرگرمی ہے۔ میں نے اُس میں لکھ دیا ہے کہ آپ عباراتِ روئداد کاٹ دیجیے ہم تسلیم کر لیں گے۔ یہ اسی غرض سے لکھا ہے کہ کسی طرح ندوہ قبول کر لے۔ غرض مولانا محدث سورتی کے مواجہہ میں ڈھائی گھنٹے تک مولوی حقانی صاحب نے اسی قسم کی باتیں حضرت عالمِ اہلِ سنّت سے کہیں۔ اپنے اعتراضات حضرت ممدوح نے ندوہ پر فرمائے سب تسلیم کیے اور فرمایا: مولانا حق تو یہ ہے کہ آپ نے آنکھیں کھول دیں۔ اہل ندوہ اگر نہ بھی مانیں تاہم اب ویسے شتر بے مُہار نہ رہیں گے۔ مولانا میں بھی آپ کی طرح مذہب میں بہت سخت ہوں۔ ندوہ میں۔۔۔۔ بھرے ہیں۔ مولوی محمد علی صاحب ایک نرم آدمی ہیں انھیں بدمذہبوں نے دبا لیا ہے۔ میں وہابیوں، نیچریوں، غیر مقلدوں کا سخت دشمن ہوں۔ مجھ سے پابندیِ مذہب کو کہنا ایسا ہے کہ کسی سے کہا جائے جورو کو عصمت سے رکھو۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ آپ کی مثل دو ایک عالم میرے ساتھ ہو جائیں تو ان سب بدمذہبوں کو نکال دیں۔ آپ اصلاح کیجیے اگر ندوہ نہ مانے تو آپ تنہا کیوں الگ ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی لے کر الگ ہویئے۔ یہ باتیں فرما کر خود حقانی صاحب نے اُسی جلسے میں ایک عبارت دوبارہ پابندیِ مذہبِ اہلِ سنّت تصنیف فرمائی کہ اس پر ندوہ سے دستخط لیں گے۔ بعدہ پھر تینوں صاحب مجمع عام میں آئے۔ یہاں حضرت عالمِ اہلِ سنّت نے بعض جگہ اجمال کو تفصیل، ابہام کی توضیح فرما کر سب حاضرین کو سنائی۔ یہ اصلاح شاہ سلیمان صاحب وحافظ عزیز الدین صاحب دہلوی وغیرہما بہت صاحبوں کے مواجہہ میں ہوئی۔ وہ پرچہ حقانی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا مع اصلاح بعینہٖ ہمارے پاس موجود ہے کہ اُس کی معاف شدہ نقل حقانی صاحب وہاں لے گئے رات کے دس بجے جلسہ ختم ہوا۔ آگے صدائے برنہ خاست۔ یارب ندوہ نہ تھا شہر خموشاں تھا۔"[11]

یہ تو مولوی عبدالحق صاحب حقانی کی حق پسندی کا نمونہ ہے جس میں شاہ سلیمانی پھلواروی صاحب بھی شریک ہیں لیکن پھلواروی صاحب کو حقانیت سے جتنا لگاؤ اور مذہبِ اہلِ سنّت وجماعت کی جانب جتنا جھکاؤ تھا اُس کا ذرا سا نمونہ بھی ملاحظہ ہو: "جس دن شاہ سلیمان صاحب تشریف لائے اور حضرت عالم اہلِ سنت سے ملاقی ہوئے مجمعِ مسلمین میں وہ پرچہ اختلافِ راقم مذکورہ قاف بھی دکھایا گیا کہ حضرت علمی رسائل کا یہ آراستہ جواب، پیراستہ صلہ ملاحظہ ہو۔ سلیمان صاحب نے اُن قاف والی جلوہ گرمی کی چند ہی سطریں دیکھ کر نہایت طیش وغیظ ظاہر فرما کر جھنجلائی ادا سے دُور پھینک دیا مگر قصور معاف انسداد کچھ نہ ہوا۔"[12]

چند علمائے اہلِ سنّت ایسے تھے جو ندوہ کے پُر فریب اور بظاہر خوشنما جال میں پھنس گئے تھے۔ عام مسلمانوں میں سے اگر کسی نے ندوہ سے کچھ تعلق رکھا تھا تو اُن علمائے اہلِ سنّت کی شرکت کے باعث رکھا تھا۔ ان حضرات ہی میں ایک مفتی لطف اللہ علی گڑھ رحمۃ اللہ علیہ بھی

تھے۔ جو کچھ عرصے کے بعد ندوہ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گئے تھے۔ جب تک شامل رہے ندوہ کے پُر اسرار اصولوں کی پابندی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے بھائیوں یعنی حضرات علمائے اہلِ سنّت کی اپیلوں، درخواستوں پر کان نہیں دھرتے تھے۔ ایسی ہی ایک اپیل پر خاموشی اور ٹال مٹول ملاحظہ ہو: ''انیس (۱۹) اہلِ علم و معززین بریلی نے ایک استفتاء آٹھ سوال پر مشتمل جناب مفتی صاحب کی خدمت میں رجسٹری شدہ بھیجا اور ضمن سوالات میں فتووں کا بوجوہِ کثیرہ مخالفِ ندوہ ہونا روشن کردیا۔۔۔ مفتی صاحب نے جواب تحریر نہ فرمایا۔ بلکہ یہ تحریر فرمابھیجا کہ میں تہئیہ سفر ندوہ میں ہوں مجھ سے جواب نہیں ہوسکتا۔ طرفہ یہ کہ کاغذ استفتاء میں واپس نہ فرمایا۔ حالانکہ سائلوں نے صراحتاً اس کے واپس کرنے کو لکھ دیا تھا۔۔۔ وہ واقعہ مذکورہ مع استفتاء بالتفصیل اشتہار مطبوعہ ۱۴ر شوال میں شائع ہوکر خود مفتی صاحب کی خدمت میں (جب وہ یہاں تشریف لاکر صدرِ ندوہ ہوئے) بھیج دیا گیا کہ جناب اب تو تہیۂ سفر سے فارغ ہیں اب جواب عنایت ہو۔ مگر وہاں تو ٹھہر چکی ہے کہ ایک ندوہ اور ہزار چپ۔''[۱۳]

حق کا اظہار ضروری ہے اور باطل کو چھپایا جاتا ہے۔ اُس کے اُوپر بڑے بڑے خوشنما پردے ڈالے جاتے ہیں تاکہ باطل کا اصل مکر وہ چہرہ کسی کو نظر نہ آئے۔ ندوہ کی شرارت پر اسی لیے پردے ڈالے جارہے تھے۔ سراسر نجاست تھی جسے چھپایا جارہا تھا۔ دعویٰ تو تھا اصلاحِ مسلمین ورفعِ اختلاف و صلحِ عام ورفعِ نزع وخیر خواہیِ اسلام کا اور کام کررہے تھے کہ حق کو مٹایا جائے، باطل کو سینے سے لگایا جائے اور سمجھانے بجھانے والے کو بدخواہِ اسلام و مسلمین بتاکر، دشمنِ صلح و اتحاد ٹھہراکر عام مسلمانوں کی نظروں میں گرایا جائے۔ اہلِ علم اس روش کی وضاحت چاہتے تو منہ سے زبان غائب ہوجاتی۔ عام مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے نکلتے تو ندوہ کے ہر ابجد خواں کے منہ میں گز بھر کی زبان ہوتی تھی۔ مفتی صاحب کے ایسے ہی سکوت اور مولانا عبدالقادر بدایونی علیہ الرحمہ کی جانب سے تمام حجت کی انتہا ملاحظہ فرمائی جائے: ''حضرتِ ممدوح (تاج الفحول مولانا عبدالقادر) نے حسب درخواست اہلِ اسلام ۲۶ر شوال روزِ جمعہ کو مسجدِ جامع میں جناب مفتی (لطف اللہ) صاحب سے بذریعہ حلف باہمی وساطتِ قرآنِ عظیم اس امر کا تصفیہ کرلینے کا ارادہ فرمایا۔ مگر حضرت موصوف اور بہت مسلمین سنتوں میں مشغول تھے کہ مفتی صاحب روانہ ہوئے۔۔۔ مفتی صاحب کسی طرح نہ رُکے، ناچار حضرت ممدوح نے مسجد جامع میں سعادت فرمائی اور برسرِ منبر ہزارہا مسلمانوں کے مجمع میں، جن میں بہت اہلِ علم، خصوصاً بعض اکابرِ ندوہ بھی تھے۔ بخوبی مفاسد ندوہ کا اعلان کیا اور بار بار باصرار فرمایا کہ جو میرے بیان کو غلط جانتے ہوں۔ بلا تامل اظہار فرمائیں، کوئی جواب دہ نہ ہوا۔ پھر وہیں برملا ہزاروں کی جماعت میں حضرت ممدوح نے ہر مسلمان کو اپنا وکیل کیا کہ ہمارے اعتراضات کا جواب مفتی صاحب سے لادیں، مگر مفتی صاحب کی طرف سے سوائے سکوت وگریز کے آج تک کچھ ظاہر نہ ہوا۔''[۱۴]

مفتی لطف اللہ صاحب علی گڑھی سے تصفیے کی آخری کوشش اور اُس کا انجام دیکھیے: ''جب جناب مفتی صاحب نے مجمع کی ملاقات نامنظور فرمائی، حضرت عالمِ اہلِ سنّت (فاضل بریلوی) نے ہمارے شہر کے معزز ذی علم رئیس جناب سید محمد نبی صاحب مختار کو تکلیف توسط دی۔ وہ اور دوسرے عالی قدر رئیس جناب حکیم محمد اکرام الدین صاحب جناب مفتی صاحب کی خدمت میں گزارش پیرا ہوئے کہ حضرت تاج الفحول وحضرت عالمِ اہلِ سنّت دونوں صاحبوں کو یا دونوں میں سے جس ایک کو آپ گوارا فرمائیں صرف پندرہ منٹ کے لیے ملاقات کی اجازت دیں، وہ تنہا آئیں گے۔ فرمایا، ندوہ کے بارے میں گفتگو کریں گے؟ کہا اور غرض کیا ہے؟ فرمایا ویسے تشریف لائیں میرا فخر ہے مگر اس باب میں کچھ نہ کہیں۔ ہر چند عرض کی کہ حضرت! آخر یہ ندوۃ العلماء ہے، اس کی بابت ہر عالم کو گفت و شنید کا استحقاق ہے۔ وہابی، نیچری، رافضی، غیر مقلد سب سے چیسدگی ہو اور علمائے اہلِ سنّت سے یوں کشیدگی؟ مگر مقبول نہ ہوئی۔ مفتی صاحب بار بار اپنی مقدس انگلی اپنے مبارک منہ پر رکھتے تھے کہ ندوہ کے باب میں تو یہ ٹھہر گئی ہے۔ یعنی چُپ۔۔۔ غرض پون گھنٹے تک دونوں رئیسوں نے ہر طرح گزارش کی مگر ایک نہ، ہزار نہ، یہاں تک کہ یہ صاحب حیران رہ گئے کہ الٰہ العالمین یہ مضمون کیا ہے۔''[۱۵]

مضمون یہی تھا کہ اراکینِ ندوہ حکومت کے ہاتھوں میں چوں قلم دردست کاتب ہوگئے تھے۔ برٹش گورنمنٹ کی ہدایتوں سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اپنی مرضی سے کچھ کرنے کے مجاز نہیں رہ

گئے تھے۔ ضمیر کو کھوٹے داموں فروخت کیا ہوا تھا۔ اسلام و مسلمین کی خیر خواہی کا ڈھول بجانا اور اندرونِ خانہ جڑیں کاٹنا معمول تھا۔ جس کے صلے میں نوازے جا رہے تھے۔ ذرا مولوی خلیل الرحمٰن صاحب پپلی بھیتی کے اس بیان کی تہ میں جھانکنے کی کوشش تو فرمایئے جس کا ذکر مولانا یقین الدین صاحب بریلوی نے یوں کیا ہے: ''یہ بالائی حضرات کی کارروائیاں تھیں جن کی خوبیاں جناب ناظم صاحب کی نیک نیتوں پر محیط ہوگئی ہیں، یہاں تک کہ ایک بزرگوار رکنِ ندوہ (مولوی خلیل الرحمٰن صاحب رکن ندوہ) قسم اول مقیم پیلی بھیت نے علانیہ حضرت ناظم سے کہا کہ صاف ثابت ہو جائے کہ مولوی احمد رضا خاں حق پر ہیں۔ اس پر بھی اگر اُن کے قدم جلسے میں آئے تو ہم چل دیں گے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ انّآ اِلَیہِ رَاجِعُوْن۔ ایسی حق پسندیوں کا علاج کیا ہے؟''[16]

اس سے صاف واضح کہ ندوہ کے ذمّے دار اراکین بھی اپنی باطل پرستی، حق دشمنی سے بخوبی آگاہ تھے لیکن دنیاوی کاروبار آرام سے چل رہا تھا۔ جس کی خاطر خود بھی اس جال میں پھنسے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو اس میں پھنسانے، اپنے ساتھ جہنم میں لے جانے پر مصر تھے۔ شب و روز اسلام و مسلمین کی اسی بد خواہی میں کوشاں رہتے تھے اگرچہ زبانی کلامی دعویٰ اتفاق و اتحاد اور صلحِ کلیت کا تھا۔ لیکن بد مذہبوں سے پیار اور اہلِ حق سے خار۔ گمراہ گران کے پیشوا و امام اور علمائے اہلِ سنّت ناقابل خطاب و کلام یہی تو وہ شرارت تھی جس کے لیے حکومتِ وقت نے یہ بظاہر خوشنما جال بچھایا تھا کہ حق کو دبایا اور باطل کو سینے سے لگایا جائے لیکن

نورِ خدا ہے کفر کی ظلمت پہ خندہ زن!
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اللہ تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے۔ باطل کی آندھیاں خواہ وہ کسی شکل میں بھی آئیں، خالص کفر کے روپ میں یا اسلامی شکل بنا کر لیکن وہ اس شمع ہدایت کو بجھانے میں نہ آج تک کامیاب ہونے پائی ہیں اور نہ قیامت تک ایسی کوئی آندھی اسے بجھا سکے گی۔ مولانا یقین الدین صاحب بریلی نے اُس وقت اراکینِ ندوہ کے بکے ہوئے ضمیروں کو جھنجوڑتے ہوئے ان لفظوں میں اُن پر اتمامِ حجت کا فریضہ ادا کیا تھا: ''کیوں حضرات! ایک ذرا اپنے آپ کو بادشاہِ قہار و جبار جل جلالہ کے دربار میں حاضر تصور کر لو اور پھر دہرم دہرم سے بول چلو کہ جن باتوں کو ندوہ کے جھوٹے دعووں، نمائشی ادعاؤں، نیچری کلوں کی ساختہ کالاؤں نے حرام، الحاد، کفر، ارتداد، موجبِ رد اعمال و دخولِ سقر و ناقابل بخشش و توہینِ ربّ اکبر ٹھہرایا تھا، اُن میں سے کچھ بھی اُٹھا رکھا بغرض باطل اس معاملے میں علمائے سنت ہی تمہارے نزدیک سراسر خطا پر سہی، کیا تمہارے حسابوں شرکت کلمہ و قبلہ بھی نہ رہی؟ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ من گھڑت احکام نیچریوں وہابیوں رافضیوں، لامذہبوں سب کے لیے ہوں۔ سب کو جگہ بناؤں چھاتی سے لگاؤ اور علمائے کرام، اصحابِ سنت سے یوں پیٹھ پھیرو، یوں دشمنی بناؤ، یوں لڑائی ٹھانو یوں روٹھا رچاؤ؟ ہاں ہاں تین برس کی مہلت ہے، سب چھوٹے بڑے مل کر بتاؤ کہ وہ کیا فرق ہے جس کے باعث گمراہوں سے صرف کلمہ گوئی پر اتفاق فرض، اتحاد ایمان، نزاع حرام رد و قدح عصیان، کشیدگی کفر، رنجش کفران اور علمائے اہلِ سنّت کے باقی عقائد متحدہ درکنار اُن کا کلمہ و قبلہ تک آپ کی سرکار میں محض بیکار۔ اُن کا اعزاز حرام، اُن کی آبرو حلال، اُن سے کھینچنا فرض، اُن سے جھکنا وبال، اُنہیں گالیاں دینا تہذیب کا کمال اور اُن کی ہجویں چھاپنا کلیجے کا صندل اُن پر بہتانوں کی بوچھاڑ دیانت کا منگل۔ ہاں ہاں وجہ بتاؤ اور جلد بتاؤ ورنہ براہِ انصاف صاف اقرار لاؤ کہ مقاصد و دعاوی ندوہ سب جھوٹ خرافات تھے۔ نیچری لٹک سے نمائش کی بات تھی۔ قول سے فعل دور و مہجور ہے۔ بحکم آیت خدا سے دشمنی پوری منظور ہے۔ ہاں ہاں اس شہر خموشاں میں اگر کوئی دم رکھتا ہے۔ جواب دے، جواب دے۔ جواب دے، ورنہ اللہ اللہ ورسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حضور روبکاری ہونی ہے۔''[17]

امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ نے جب اراکین ندوہ کو خوب سمجھا کر دیکھ لیا۔ خوفِ خدا و خطرۂ روزِ جزا سمجھا کر دیکھ لیا اور بخوبی محسوس کر لیا کہ یہ حضرات کسی طرح بھی باطل سے عدول کرنے اور حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تو اسلام و مسلمین کی خیر خواہی کا حق ادا کرنے اور بھولے بھالے مسلمانوں کو ان کے جال میں پھنسنے سے بچانے کی غرض سے سرمایۂ ملّت کے اس نگہبان اور کشتی ملت کے اس ناخدا نے اراکینِ ندوہ کو علمی میدان میں آنے کی دعوت دی تا کہ کھرے اور کھوٹے کو، حق اور باطل کو ہدایت اور گمراہی کو، دودھ اور پانی کو سب کے سامنے جُدا جُدا اور واضح کر کے دکھا دیا جائے حق و باطل کو سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ باقی نہ رہ جائے۔ اس

مرحلے پر آپ نے ندوہ کے ذمّے دار حضرات کو یوں نام لے لے کر پکارا اور اُن پر خدا کی حجت یوں تمام کر کے دکھائی تھی:

"اب پچیسویں بار پھر عرض کی جاتی ہے کدھر ہیں ندوہ کے حواسِ خمسہ؟ کہاں ہیں مولوی لطف اللہ صدرِ ندوہ؟ کدھر ہیں ناظم صاحب؟ کہاں ہیں حقانی صاحب؟ کدھر ہیں پھلواروی صاحب؟ کہاں ہیں مولوی محمد شاہ صاحب رامپوری؟ اگر دعوائے سُنیت و ادعائے فضیلت ہے سامنے آئیں؟ مردِ میدان بنیں، اظہارِ حق کا بیڑہ اٹھائیں۔ اہلِ سنّت کے ایک سو نوے سوالوں کے جواب دیں۔ ندوہ کی بگڑی بنائیں ایک ایک سوال ہم پیش کریں، آپ پانچوں حضرات جواب دیتے جائیں۔ خانہ نشینی سے کام نہیں چلتا۔ خاموش گزینی سے حق نہیں کھلتا، اعلان، تقاضا کہاں ہے۔ فضیلت کی شرم؟ کس دن منہ دکھایئے گا؟ کب تک حق ظاہر فرمایئے گا؟۔۔۔ یہ پہلے عرض کر دی گئی ہے کہ نری زبانی تُو تُو مَیں مَیں کام کی نہیں۔ یہ خاص چالاکی کی گلی، کہنے مکرنے کی راہ کھلی ہے۔ مغلوب ہو جایئے اور جلسہ اڑایئے۔ نہیں جو فرمایئے۔ لکھ کر دیتے اور لکھا ہوا لیتے جایئے کہ ہاتھ کٹے رہیں، بدلنے مچلنے کے پہلو مٹے رہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ العزیز آن کی آن میں حق کھل جائے گا۔ انصاف واحتساب نظروں میں تُل جائے گا۔ آپ کو سال آئندہ تک مُہلت ہے۔ جلسۂ آئندہ سے پہلے تصفیے کی دعوت ہے۔ اگر یہ سال بھی گزر گیا اور آپ نے بے تصفیہ و مناظرہ کہیں جلسہ کر لیا تو پھر علم و حق پرستی کا نام نہ لینا۔ پھر اعتقادِ عوام کا بھی اُٹھنا دیکھیے گا۔ آپ کے تھامے تھمے تو تھام نہ لینا۔ ہاں ہاں اب ذرا شوق و انتظار نہ بڑھایئے۔ حق چھپایا ہے رُخ نہ چھپایئے۔ تشریف لایئے۔ جلوہ فرمایئے۔ نصیب میں ہے تو حق و ہدایت سا چمکتا جوہر نذر میں پایئے۔"[۱۸]

جب مجددِ مائۃ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر طرح حجت تمام کر لی۔ حق و باطل کو واضح کر کے دکھا دیا اور سب پر ظاہر ہو گیا کہ ندوۃ العلماء محض ایک دھوکے کی ٹٹی ہے۔ حکومت کی چال ہے جس کے پُر فریب ڈھول پر نیچریت کی کھال ہے۔ ندوہ کیا ہے۔ اہلِ حق کو دبانے اور اہلِ باطل کو چمکانے، سینے سے لگانے کا ایک جنجال ہے۔ لہٰذا اراکینِ ندوہ وضوحِ حق کے بعد بھی اس اسلام دشمنی کی روش سے قطعاً باز نہ آئے۔ گمراہ گری کے میدان میں اپنی چلتی خوب جوہر دکھائے۔ اسی طرزِ عمل کے بارے میں مولانا محمد یقین الدین صاحب قادری بریلوی مرحوم نے یہ وضاحت فرمائی تھی:

"غرض حضراتِ کبرائے ندوہ پر تو وہ گزری، جو اُن کا دل ہی خوب جانتا ہے۔ جب تک جئیں گے بریلی کا نیستان خواب میں دیکھ کر چونک چونک پڑیں گے۔ آپس میں جسے ڈرانا ہو گا یہی کہہ کر دھمکائیں گے کہ دیکھ وہ بریلی کا ڈنڈا قریب جسے کوسنا ہو گا یونہی کوسیں گے کہ یارب! تجھے بریلی کا پانی نصیب مگر بالائی حضرات نے وہ اُدھم جوتا، وہ دھما چوکڑی مچائی، وہ ملک بھر کی زمین سر پر اٹھائی، بات بات میں وہ شرافت نجابت ظاہر فرمائی کہ باید و شاید۔ گلی کوچے میں، ہر مہمل پرچے میں، جلسوں بازاروں میں، متعدد اخباروں میں علمائے اہلِ سنّت پر تبرّا ہوتا ہے۔ تہذیب و انسانیت کی دونالی بندوقوں میں تمسخر و تحقیر کا چھرّا ہوتا ہے۔ حال کے علمائے کرام آسودگانِ دارالسلام سب کو صلوٰتیں سنائی جاتی ہیں۔ حد یہ کہ گالیاں چھاپ چھاپ کر شائع کی جاتی ہیں۔"[۱۹]

اراکین ندوہ کی اس سراسر نامعقول روش پر مسلمانوں کا دل دکھتا تھا۔ لیکن انھیں اس کی پروانہ تھی۔ حق و صداقت اور علمائے اہلِ حق کی دن دہاڑے تحقیر و تذلیل کی جاری تھی لیکن ندوہ اور قائم کس لیے ہوا تھا؟ اسی طرزِ عمل کے پیشِ نظر تو مسلمانوں کو یُوں دعوت غور و فکر دی گئی تھی: "اہلِ اسلام رسائل اہلِ سنّت اور اُن تحریراتِ حمایت کو موازنہ کر کے فرما سکتے ہیں کہ علمی رسالوں، شرعی سوالوں، دینی مقالوں، تواضع کی تحریروں، الحاج کی تقریروں کا یہی جواب تھا، یہی صلہ تھا جو حضراتِ ندوہ کی سرکار سے ملا؟ افسوس کہ ابھی وہ خطوط عام مسلمین کی نظر سے نہ گزرے جو حضرت عالمِ اہلِ سنّت (فاضل بریلوی) نے مراسلاتِ مطبوعہ کے علاوہ خاص طلبِ صلاح و اصلاح میں مفتی صاحب و ناظم صاحب کو لکھے۔ مسلمان اگر انھیں دیکھیں پھر حضرات کی گالیاں ملاحظہ کریں، پتھر کے کلیجے بھی کانپ اُٹھیں کہ اللہ اللہ ایسی انتہائی تواضع کا یہ معاوضہ ملتا ہے۔ مگر قیامت نہ آئے گی؟ حشر نہ ہو گا؟ اعمال ناموں کا نشر نہ ہو گا۔"[۲۰]

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام و مسلمین کی خیر خواہی سے سرشار ہو کر ندوہ کی برطانوی شرارت کا جس طرح تقریر و تحریر کے میدان میں ڈٹ کر مقابلہ کیا اُس کا اپنوں کے علاوہ غیروں اور شدید مخالفوں کو بھی اعتراف ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب جیسے نیچریت نواز نے بھی مجدد مائۃ حاضرہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس عظیم الشان کام کو تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ ہی گورنر کی مخالفت کرنے کی پخّر بھی لگا دی ہے۔ حالانکہ وہ نمائشی بات تھی بہر حال موصوف یوں رقمطراز ہیں:

"اُسی زمانہ میں ندوہ پر دو طرفوں سے حملے شروع ہوئے۔ ایک تو سر انیٹونی میکڈانل جنھوں نے صوبہ بہار میں اردو کا قلع قمع کیا تھا اور اب

صوبجات متحدہ کے گورنر تھے۔ وہ ندوہ کے سخت مخالف ہوگئے اور اس کو سیاسی سازشوں کا ایک آلۂ کار سمجھ کر شک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ دوسرے مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے بعض پُر جوش رسائل ندوہ کے خلاف لکھنے شروع کیے اور ندوہ کے مقابلے میں ایک جماعت ''جدوہ'' قائم ہوئی۔ ندوہ ان دو مخالفوں کے درمیان موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا۔''[۲۱]

چنانچہ اُس دَور کا ندوہ جس کا امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے محاسبہ فرمایا تھا وہ علمائے اہلِ سنّت کو پھنسانے، باطل کو چمکانے اور حق کو دبانے کی خاطر ایک بظاہر خوش نما اور در حقیقت بڑا ہی پُر فریب جال برٹش گورنمنٹ نے بچھایا تھا۔ اُس کے بارے میں حضراتِ علمائے کرام نے یوں حکم شرع بیان فرمایا تھا: ''ندوہ عمومِ فساد ہے، ہجومِ الحاد ہے، ہدایت کا رَد، حق کا انسداد ہے۔ ہوا پرستی ہے، فتنہ ہے، آتشِ بلا ہے، فسادوں کی انجمن ہے، مکروں کی سبھا ہے، بہرا فتنہ ہے، اندھی بلا ہے، تاریک اندھیری ہے۔ مجلسِ ندوہ مذہبِ اہلِ سنّت کی توہین کرتی ہے۔ اہلِ سنّت کی بدخواہ ہے۔ اللہ و رسول (جل وعلا و صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) و مومنین سب کی خائن ہے۔ حرام کراتی اور فرض سے بچاتی ہے۔ احکامِ الٰہیہ سے ضد باندھتی۔ اس کی شرکت بڑی آگ ہے۔ مال یا بدن سے اس کی اعانت گناہوں کا انبار ہے۔ ندوہ باطل ہے۔ نری ہوائے نفس و پیروی شیطان ہے۔ مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس میں نہ جائیں۔ ظاہراً یہ انجمن کافروں کے مکرِ پنہاں سے قائم ہوئی جس پر اس کا نام ''ندوہ'' ہی دلیل ہے۔ گمان میں ہوتا ہے کہ اس مجلس سے ان کی مراد اپنے اُنھی دوستوں کی سنّتیں جگانا ہے جنھوں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی دشمنی میں ندوہ بنایا تھا۔''[۲۲] اُن حضرات کثر اللہ سعیہم نے اراکینِ ندوہ کے بارے میں شریعت مطہرہ کا حکم یُوں بیان فرمایا:
''محمد شاہ صدرِ دوم ندوہ و ناظم و دہلوی و آری و انصاری سب غیر مقلد ہیں۔ وہابیوں بدمذہبوں کے گرگے ہیں۔ صریح گمراہی میں اُن کے شریک ہیں۔ انھوں نے شرعِ مطہر سے ضد باندھی اور مسلمانوں کو مضرت دی۔ کھُلے ظالم گمراہی کی طرف بلانے والے ہیں۔ انھوں نے اجماعِ اُمت توڑا، جماعت کو چھوڑا، محبِّ بدعت ہیں۔ بدخواہِ سنت ہیں، مانعِ طاعت و آمرِ معصیت ہیں۔ داعیِ اُمت بسوئے لعنت ہیں۔ بالجملہ حضراتِ اراکین سب اہلِ سنّت سے خارج ہیں۔ اِن پر اپنے عقائدِ ضالّہ خیالاتِ باطلہ سے توبہ فرض ہے۔ توبہ نہ کریں تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان سے کنارہ کش ہوں۔ ان سے دور رہیں۔''[۲۳]

جو علمائے اہلِ سنّت شروع میں ندوہ کے اندر شامل ہوگئے تھے۔ جب اُن پر اس کی عیاری کا انکشاف ہوا تو فوراً جدا ہوگئے اور آخر کار اس میں وہی حضرات رہ گئے تھے جنھوں نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی قبول کی، دنیا کے آرام وراحت کے بدلے آخرت کی ابدی زندگی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ یہ حضرات خود گمراہ ہوئے اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں شب و روز کوشاں رہتے تھے۔ یعنی ؎

رہِ منزل میں سب گم ہیں مگر افسوس تو یہ ہے
امیر کارواں بھی ہیں اُنھیں گم کردہ راہوں میں

## حواشی

۱۔ عبد الحی لکھنوی، مولوی و حکیم۔ ''نزہتہ الخواطر''، جلد ہشتم، ص ۴۰۔
۲۔ شیخ محمد اکرم مؤرخ، ''موج کوثر''، بار ہشتم، ص ۱۸۷، ۱۸۸۔
۳۔ شیخ محمد اکرام، ''شبلی نعمانی''۔ ص ۱۷۸۔
۴۔ شیخ محمد اکرم، ''شبلی نامہ''، ص ۲۴۵۔
۵۔ اشرف علی تھانوی، مولوی، ''الافاضات الیومیہ''، جلد پنجم، ص ۱۱۰۔
۶۔ ایضاً، جلد ششم، ص ۹۸۔
۷۔ ابو الکلام آزاد، مولوی ولیڈر، ''آزاد کی کہانی''، ص ۲۱۷، ۲۱۸۔
۸۔ محمد صابر نسیم، بستوی، مولانا، ''مجدّد اسلام''، ص ۱۸۷، تا ۱۹۱۔
۹۔ محمد یقین الدین قادری بریلوی، مولانا، ''سرگزشت وماجرائے ندوہ''، مطبوعہ نادری پریس بریلی، ص ۲۹۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۲۱۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۳۸۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۶۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۱۹۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۸۴۔
۱۸۔ ایضاً، ص ۳۷۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۳۷۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۴۱۔
۲۱۔ امام احمد رضا خاں، مجدد، ''فتاوی الحرمین برجف ندوۃ المین''، لاہور، ۱۳۹۴ھ / ۱۹۷۴ء، ص ۲۲، ۲۳۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۲۲۔۲۳۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۲۲۔

# اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں کانفرنس ۲۰۱۱ء

پروفیسر محمد شکیل صدیقی

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (1856-1921) برِ عظیم جنوبی ایشیا کی ایک معروف و ممتاز دینی، علمی اور روحانی ہستی، جن کے علم و عرفان اور فن و کمالات کا دائرہ ایک دو نہیں، درجن دو درجن نہیں بلکہ معلوم تحقیق کی روشنی میں آپ 71 سے زائد علوم وفنون پر کمال و دسترس رکھتے تھے۔ اسی طرح ہر علم و فن پر موجود آپ کی اس تحریری یادگاروں کی تعداد بھی ایک ہزار کے لگ بھگ ہے، فتویٰ نویسی اور شعر و سخن (نعتیہ شاعری) آپ کے علم و فن کا وہ خصوصی میدان ہے جو آپ کے مسلک و مکتب (اہلِ سنّت) کی شناخت و پہچان اور بے شمار ارادت مندوں اور عقیدت مندوں کا دینی و علمی اور فکری وسیاسی محاذ (Platform) بھی ہے۔ اعلیٰ حضرت فن فتویٰ نویسی میں اپنے معاصرین میں ممتاز و منفرد تھے۔ انھوں نے پچاس سال تک فتویٰ نگاری کی، جس کا اعتراف حکیم الامت اور شاعر مشرق علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہے:"ان کے فتاویٰ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اعلیٰ اجتہادی صلاحیتوں سے بہرہ ور فقیہہ تھے۔" فقہ میں "ردالمختار" اور "فتاویٰ رضویہ" کے علاوہ امام صاحب کی ایک اور دینی وعلمی خدمت "قرآنِ مجید" کا ترجمہ (کنزالایمان فی ترجمہ القرآن) ہے جو آپ نے 1911ء میں کیا اور جس کے حواشی "خزائن العرفان فی تفسیر القرآن" کے عنوان سے صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین صاحب مراد آبادی علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمائے۔ شعر و سخن میں آپ کا محور وموضوع ذات وصفات مصطفوی ﷺ ہے جس نے برِ عظیم کے مسلمانوں میں عشقِ رسول ﷺ کی ایسی جوت جگائی جو عشقِ مصطفیٰ ﷺ اور تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ کی تحریک بن گئی۔ آپ کا معروف سلام:

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

بلالحاظِ مسلک و مکتب، شمعِ رسالت ﷺ کی دلوں کی دھڑکن، ایمان وعقیدت محبت کی علامت ہے۔ اعلیٰ حضرت مجدد ملت امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں سیاسی تحریک کے ایک خاص موڑ (تحریکِ ترکِ موالات) پر ہندو مسلم سیاسی اتحاد کی سازش کو بے نقاب کرتے ہوئے فتویٰ دیا کہ: "نصاریٰ کی یہ غلامی کہ پیرِ نیچر (سید احمد خاں) نے تھامی، لیڈر جس کے آپ زبانی شاکی ہیں اور دل سے پرانے حامی۔۔۔ اب اگر بعد خرابی بصرہ آنکھیں کھلیں اور اسے چھوڑنا چاہتے ہیں، مبارک ہو اور خدا سچ کرے اور راست لائے، مگر للہ انصاف! وہ غلامی ادھوری تھی۔۔۔ اور اب مشرکین (ہندوؤں) کی پوری غلامی ہو رہی ہے، ان کے ساتھ یہ سب کچھ اور ان سے بہت زائد کیا جارہا ہے، یہ کون سا دین ہے؟ نصاریٰ کی ادھوری غلامی سے اجتناب اور مشرکین کی پوری (غلامی) میں غرقاب۔"

امام صاحب کے معتقدین علمائے اہلِ سنّت نے اپنے ایک اجلاس منعقدہ بنارس (1946) میں ایک قرار داد کے ذریعے متفقہ طور پر مطالبۂ پاکستان کی حمایت کی اور قیامِ پاکستان کے بعد "جمعیتِ علمائے پاکستان" نے حضرت علامہ شاہ احمد نورانی علیہ الرحمۃ کی قیادت میں پاکستان میں نظام مصطفیٰ ﷺ کے قیام اور اتحادِ امت کے لیے گرانقدر خدمات سر انجام دیں۔ اس طرح میدانِ سیاست میں بھی اعلیٰ حضرت کا فیض جاری ہے۔ اعلیٰ حضرت کی دینی و علمی خدمات اور سیاسی افکار کی تبلیغ و ترویج اور مطالعہ و تحقیق کے لیے پاکستان میں "ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا انٹرنیشنل" کی مساعی قابلِ تحسین ہیں۔ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کا قیام 1980ء میں سید ریاست علی قادری علیہ الرحمۃ کی قیادت میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے مؤسسین میں پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، حضرت شمس بریلوی، مفتی تقدس علی قادری علیہ الرحمۃ، علامہ محمد اطہر نعیمی مراد آبادی مدظلہ العالی سمیت دیگر قلمی اور مالی معاونین شامل تھے۔ 1992ء میں علامہ ریاست علی قادری کی وفات کے بعد صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری کی سرپرستی میں یہ ادارہ علمی و تحقیقی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل ہے۔ لیکن جامعہ کراچی کے معروف سائنٹسٹ اور اسکالر پروفیسر ڈاکٹر مجید

اللہ قادری کی فعال و متحرک قیادت میں مذکورہ ادارے نے علمی حلقوں میں ایک خاص مقام حاصل کیا اور فکرِ رضا کا تعارف و پیغام ملک اور بیرونِ ملک جامعات تک پہنچا۔ پروفیسر مجید اللہ قادری کی انتھک محنت و کاوش اور رہنمائی کے نتیجے میں تحقیق و مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا کام جاری ہے۔ اب تک فکرِ رضا پر پاک و ہند میں 28 پی ایچ ڈی، سیکڑوں تحقیقی مقالات، درجنوں تصانیف کے علاوہ 1981ء سے اردو اور انگریزی زبان میں ایک تحقیقی مجلّہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ معارفِ رضا باقاعدہ ہائر ایجوکیشن کمیشن سے منظوری کے آخری مرحلے پر ہے۔ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا انٹرنیشنل کا ایک اور کارنامہ سالانہ کانفرنس کا انعقاد ہے۔ 1981ء میں پہلی امام احمد رضا کانفرنس کراچی میں منعقد کی گئی۔ (22 جنوری 2011ء) کو ادارے کے تحت 31 ویں سالانہ امام احمد رضا کانفرنس، جامعہ کراچی کے شیخ زاید اسلامک سینٹر میں منعقد ہوئی جس کی صدارت شیخ الجامعہ، جامعہ کراچی پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی نے کرنا تھی لیکن وہ اپنی اچانک مصروفیت کے باعث نہ آسکے۔ چنانچہ ان کی نیابت کے فرائض اور کانفرنس کی صدارت رئیس کلیۂ فنون پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال نے کی۔ کانفرنس میں ملکی اور غیر ملکی مندوبین کے علاوہ جامعہ کراچی کے اساتذہ، عمائدینِ شہر، علماءِ کرام اور طلباو طالبات کی بڑی تعداد نے بھی شرکت کی۔ کانفرنس میں جناب پروفیسر (سینٹرل کالج، لاہور) عقیل احمد نے حضرت مولانا مفتی شفیع اوکاڑوی کی دینی، علمی اور تبلیغی خدمات پر مقالہ پیش کیا جب کہ محمد اسماعیل بدایونی نے "پاسبانِ حرمت رسول ﷺ" کے موضوع پر اور شانِ رسالت ﷺ میں صیہونی و صلیبی مستشرقین کی نام نہاد تصنیفی اور تالیفی سازشوں کو نہ صرف بے نقاب کیا بلکہ عشقِ مصطفیٰ ﷺ اور ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ کے لیے اعلیٰ حضرت کی خدمات کا جائزہ پیش کیا انھوں نے بجا طور پر نشاندہی کی کہ اہلِ صلیب نے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں سے عشقِ مصطفیٰ ﷺ کو نکالنے کے لیے مذموم حربے و ہتھکنڈے استعمال کیے لیکن اعلیٰ حضرت نے یہود و نصاریٰ کی سازشوں کو بے نقاب کیا اور اپنے منظوم و منثور کلام کے ذریعے عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے چراغ مسلمانوں کے قلوب میں روشن کیے۔ جناب اسماعیل بدایونی نے ملک کے مخصوص حالات میں تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ کے لیے حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات عام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ علامہ عباس رضوی جو کانفرنس میں شرکت کے لیے دوبئی سے تشریف لائے تھے انھوں نے اعلیٰ حضرت کی علمِ حدیث کی خدمات کے موضوع پر مفصل اور پر مغز خطاب کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں اعلیٰ حضرت کی علمِ حدیث کی خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے علما و اسکالر کے تقرر کی ضرورت پر زور دیا۔ لاہور سے آئے ہوئے مہمان مقرر پروفیسر عبدالرحمٰن بخاری نے اعلیٰ حضرت کے دینی، علمی اور سیاسی کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اعلیٰ حضرت دو قومی نظریے کے خالق اور برعظیم پاک و ہند میں ناموسِ رسالت ﷺ تحریک پاکستان کا دوسرا نام پاکستان اور احمد رضا خاں دو مختلف چیزیں نہیں بلکہ دونوں ایک نام ہیں۔ دستور کی دفعہ 295C کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ تہذیبوں کے تصادم اور مغربی و اسلامی تہذیب کے درمیان 295 C ایک حد فاصل ہے۔ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے نظامِ مصطفیٰ پارٹی کے مرکزی قائد جناب الحاج حنیف طیب نے کہا کہ قانونِ تحفظِ ناموس رسالت ﷺ کا جنرل ضیاء الحق سے کوئی تعلق نہیں ہے جب یہ بل اسمبلی میں پیش کیا گیا تھا تو اس میں گستاخیِ رسول ﷺ کی سزا عمر قید تجویز کی گئی تھی جسے میں نے اور علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری اور شاہ تراب الحق نے وزیر قانون کو پیش کرنے سے روک دیا اور مطالبہ کیا کہ گستاخیِ رسول کی سزا موت اور پھانسی دی جائے۔

کانفرنس سے ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کے صدر جناب وجاہت رسول قادری نے اپنے خطاب میں کہا کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی علم و عمل اور عشقِ رسول ﷺ کا پیکر تھے۔ ناموسِ رسالت ﷺ کا تحفظ اور عشقِ اعلیٰ حضرت کی ایمانی غیرت کا امتیاز تھے۔ انھوں نے کہا کہ ادارے کو ٹرسٹ کی شکل دے کر اسے محفوظ ہاتھوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ تعلیماتِ رضا کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا رہے گا۔ سرپرستِ اعلیٰ جناب الحاج محمد رفیق پردیسی برکاتی نے اپنی سادہ و سہل گفتگو میں علم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی پسماندگی کی وجہ تعلیم اور دین سے دوری ہے ہم دنیا میں اس وقت تک ترقی اور خوشحالی حاصل نہیں کرسکتے جب

(بقیہ صفحہ نمبر 40 پر ملاحظہ فرمائے)

# اعلیٰ حضرت کانفرنس بنگلہ دیش

مولانا محمد بدیع العالم رضوی

محترم المقام واجب الاحترام مخدوم ملت رونق اہلِ سنّت ماہر رضویات مبلغ مسلک اعلیٰ حضرت مفکر اسلام الشیخ پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری:

بعد سلام مسنون امید ہے مزاجِ گرامی بخیر وعافیت ہوں گے۔ وعدے کے مطابق عین وقت پر حضرت کی خدمتِ بابرکت میں مکتوب نامہ اور رپورٹ ارسال کرنے میں تاخیر کے لیے معذرت خواں ہوں۔ صدرِ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا عزتِ مآب صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری صاحب مدظلہ العالی کے مشورے سے اعلیٰ حضرت فاؤنڈیشن کی دعوت پر سرزمین بنگلا دیش میں جنابِ مکرم کی پہلی مرتبہ تشریف آوری فدایانِ اعلیٰ حضرت کے لیے بلاشبہ نعمتِ عظمیٰ ہے۔ ہم آپ کے فون سے محترم وجاہت رسول قادری صاحب کی علالت کی خبر سن کر بہت پریشان حال ہیں اراکین فاؤنڈیشن سمیت حضرت کے لیے دعا کی گئی اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت کو جلد شفاءِ عاجلہ کاملہ تامہ عطا فرمائے اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کے لیے مزید خدمات انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

اعلیٰ حضرت فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مہمانِ اعلیٰ کی حیثیت سے حضرت کی تشریف آوری مختلف پروگراموں میں حضرت والا کا شرکت کرنا اور Visit کرنا تعلیمات رضا کے فروغ کے لیے ایک عظیم کام ہے، خصوصاً چٹاگانگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر محمد علاء الدین صاحب سے ملاقات اور ادارے سے شائع کردہ امام احمد رضا کی تصنیفات کا عطیہ دے کر ایک اہم علمی خدمت انجام دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر حافظ بدرالدجیٰ صاحب سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی اور یہاں بھی تصنیفاتِ امام احمد رضا پیش کی گئیں۔ شعبۂ عربی کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر رفیق العالم صاحب کے دفتر Visit کیا۔ اسی شعبے میں بھی کتب کا ایک سیٹ پیش کیا گیا اس وقت پروفیسر ڈاکٹر احسن سید، پروفیسر ممتاز الدین، پروفیسر جسیم الدین، پروفیسر ڈاکٹر علی احمد، پروفیسر ڈاکٹر مفیض الدین، پروفیسر محمد یونس، لکچرار ڈاکٹر ہارون، لکچرار مرشد الحق، لکچرار جعفر اللہ اور دیگر اساتذۂ جامعہ سنیہ غوثیہ اور اراکین اعلیٰ حضرت فاؤنڈیشن، پرنسپل مولانا بدیع العالم رضوی، حافظ مولانا انیس الزماں، مولانا نظام الدین، الحاج مولانا محمد عبد اللہ، مولانا محمد برھان الدین وغیرہ موجود تھے۔ مختلف شعبوں میں امام احمد رضا کی دینی خدمات کو سراہا اور مہمانِ مکرم کی بے حد پزیرائی کی۔ مختلف پروگراموں میں حضرت کے قیمتی خطاب کے لیے ہم سراپا تشکر و امتنان ہیں۔ امید ہے کہ حضرت کی دعا اور سایہ اور مفید مشورے تا دیر ہمارے سرپر باقی رہیں۔ اعلیٰ حضرت فاؤنڈیشن اور رضا اسلامک اکیڈمی کے جملہ اراکین اور محبّین کی طرف سے سلام قبول فرمائیں۔

اعلیٰ حضرت فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام ہر سال کی طرح امسال بھی بروز بدھ ۲ فروری ۲۰۱۱ء مدینۃ الاولیاء چٹاگانگ، بنگلہ دیش کی نامور ہل مسلم انسٹی ٹیوٹ میں اعلیٰ حضرت کانفرنس ۲۰۱۱ء منعقد کی گئی۔

اس کانفرنس کے مہمانِ اعلیٰ پاکستان سے آئے ہوئے ماہرِ رضویات پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری چیئرمین شعبۂ پٹرولیم ٹیکنالوجی جامعہ کراچی، جنرل سکریٹری ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا انٹرنیشنل، کراچی، پاکستان تھے۔ کانفرنس میں بنگلہ دیش کے مشاہیر علمائے اہلِ سنّت، مشائخ عظام علمائے کرام۔ دانشوروں مفکرین حضرات، مشاہیر مدارس دینیہ کے معلمین و متعلمین مختلف سنی تنظیموں کے سربراہ و منتظمین شرکت فرما کر اعلیٰ حضرت کانفرنس کو ایک عالمی تاریخ ساز کانفرنس بنادیا۔ فاؤنڈیشن کے صدرِ گرامی فاضل نوجوان پرنسپل مولٰنا محمد بدیع العالم رضوی صاحب کے زیرِ صدارت کانفرنس کی نظامت فاؤنڈیشن کے نائب صدر فاضل نوجوان حافظ مولانا انیس الزمان صاحب سیکریٹری مولانا ابوناصر طیب علی صاحب نے فرمائی۔ شام کو ۴ بجے تلاوتِ کلامِ پاک اور بارگاہِ رسالت میں نعت خوانی کے نذرانہ سے کانفرنس کا آغاز ہوا۔ شرکائے کانفرنس میں سے چند حضرات کے نام یہ ہیں: (۱) خطیب بنگال علامہ جلال الدین القادری صاحب، پرنسپل جامعہ احمدیہ سنیہ عالیہ چاٹگام وخطیب قومی مسجد جمیعۃ الفلاح چاٹگام۔

(۲)شیر ملت علامہ مفتی عبید الحق نعیمی صاحب، شیخ الحدیث جامعہ احمدیہ سنیہ عالیہ۔(۳)شہزادہ شیر بنگلہ مولانا امین الحق القادری، ھاٹھزاری دربار شریف۔(۴) استاذالعلما مفتی مولانا محمد ادریس رضوی، شاگر درشید محدثِ اعظم سردار احمد لائلپوری۔ (۵)چٹاگانگ سوداران یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر معین الدین احمد خان۔(٦) پروفیسر ڈاکٹر رضاء الکریم، شعبۂ بنگلہ کوشٹیا اسلامک یونیورسٹی۔(۷) پروفیسر ڈاکٹر محمد احسن سید۔ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز چٹاگانگ یونیورسٹی۔ (۸) مفکرِ اسلام علامہ عبدالمنان صاحب زید مجدہ، مترجم کنزالایمان، بزبانِ بنگلہ۔(۹) علامہ حافظ احمد سلیمان انصاری صاحب، چیئرمین(اواے سی) شیخ الحدیث جامعہ احمدیہ سنیہ۔ (۱۰) علامہ قاضی معین الدین اشرفی صاحب۔ سیکریٹری جنزل (اواے سی) شیخ الحدیث سبحانیہ عالیہ۔ (۱۱) پیر طریقت مولانا ہارون الرشید رضوی۔ کشورگنج۔ (۱۲) پیر طریقت مولانا صادق الرحمٰن ہاشمی صاحب۔(۱۳)شہزادہ مولانا شاہد الرحمٰن ہاشمی صاحب۔ (۱۴) جناب مرشد الحق صاحب، لکچرار شعبۂ اسلامک اسٹدیز چٹاگانگ یونیورسٹی۔ (۱۵)جناب جعفر اللہ صاحب، لکچرار شعبۂ عربی، چٹاگانگ یونیورسٹی۔ (۱٦)مفتی مولانا سید وصی الرحمٰن صاحب، استاذ شعبۂ فقہ جامعہ احمدیہ سنیہ عالیہ۔(۱۷) مولانا جلال الدین الازھری، لکچرار سوداران یونیورسٹی شعبہ اسلامیات، چاٹگام۔(۱۸) جناب وحید العالم صاحب، لکچرار۔ ہاجرہ ڈگری کالج۔(۱۹) جناب ابوطالب بلال صاحب ، لکچرار شعبۂ اسلامیات سیٹی کر فریشن ڈگری کالج۔(۲۰)الحاج مولانا محمد عبداللہ، جنزل سیکریٹری، رضا اسلامک اکیڈمی چاٹگام۔ (۲۱)الحاج مولانا ابوالکلام امیری، مولانا جلال الدین فاروقی صاحب وغیرہ۔

پاکستان سے تشریف فرما مہمانِ اعلی پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری رضوی مدظلہ نے اپنے خطاب میں سرکار اعلیٰ حضرت کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی علمی اور ملی خدمات پر روشنی ڈالی، حضرت نے فرمایا: امام موصوف دینی معلومات کے ساتھ ساتھ عقلی اور سائنسی علوم کے بھی مجدد اور امام ہیں۔ کانفرنس میں فضیلۃ الشیخ محترم المقام سید وجاہت رسول قادری صاحب مدظلہ العالی صدر، ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کا ارسال کردہ پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا اور اس کی سعادت حضرت مولانا عبدالمنان صاحب نے حاصل کی۔

اعلیٰ حضرت کانفرنس کے موقع پر بنگلہ، اردو اور انگریزی تین زبانوں پر مشتمل مجلّہ بھی شائع ہوا، جو ۸۰ صفحات پر مشتمل تھا، حاضرین میں تقسیم کیا گیا اور رضا اسلامک اکیڈمی سے شائع کردہ مندرجہ ذیل دیگر دو کتاب بزبان بنگلہ ترجمہ کردہ مفت تقسیم کی گئیں۔

(۱)۔ تحفظِ عقیدۂ ختم نبوت اور امام احمد رضا۔
تحریر از: صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری
مترجم: مولانا محمد بدیع العالم رضوی
(۲)۔ کنزالایمان کی عرب دنیا میں پزیرائی،
تحریر از: صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری۔
مترجم: پرنسپل مولانا محمد بدیع العالم رضوی۔
(۳)۔ قران سائنس اور امام احمد رضا۔
تحریر: پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری
مترجم: مولانا محمد نظام الدین۔

کانفرنس میں امام اہلِ سنّت غازی دین وملت علامہ شیر بنگلہ عزیز الحق القادری رحمۃ اللہ علیہ کی سنیت کے میدان میں خدمات کے اعتراف پر اعلیٰ حضرت ایوارڈ پیش کیا گیا اور ساتھ ہی مسلکِ اعلیٰ حضرت کے فروغ میں خدمات پر علامہ مفتی ادریس رضوی صاحب مدظلہ کو بھی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی عالمی سطح پر مسلک اعلیٰ حضرت اور تعلیماتِ رضا کے فروغ میں مزید خدمات کے اعتراف پر مہمانِ اعلی پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری صاحب کو اعلیٰ حضرت ایوارڈ اور بنگلہ زبانوں میں شائع شدہ کتابوں کا تحفہ پیش کیا گیا۔ کانفرنس کے آخر میں امام احمد رضا کی زندگی اور علمی کاموں پر مشتمل دو جامع اور حسین دستاویزی ڈاکومنٹری فلم نمائش کی گئی جو کہ محترم المقام سید وجاہت رسول قادری صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری صاحب کی عظیم کاوشوں کا ثمر ہے۔ ہم پروفیسر صاحب کے بے حد ممنون ہیں کہ حضرت نے اس کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا۔ خطبۂ صدارت میں مولانا محمد بدیع العالم رضوی صاحب نے مہمانِ مکرم اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور یوں امام احمد رضا فاضل بریلوی کے نعتیہ سلام ''مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' اور مہمانِ اعلیٰ قادری صاحب کی دعا پر یہ کانفرنس تقریباً رات ساڑھے دس بجے اختتام پزیر ہوئی۔